سورۃ البقرہ

سورۃ البقرہ ، قرآن مجید کی دوسری سورت ہے ۔ یہ مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد سے نازل ہوئی اس لئے مدنی سورت کہلاتی ہے ۔ اس میں دو سو چھیاسی آیات ، چھ ہزار دو سو اکیس کلمات ، ساڑھے پچیس ہزار حروف اور ۴۰ رکوع ہیں ۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ اس میں ایک ہزار خبریں ، ایک ہزار حکم اور ایک ہزار کاموں سے ممانعت ہے ۔ یہ قرآن مجید کی سب سے بڑی سورت ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ " سورہ بقرہ قرآن کی کوہان اور اس کی بلندی ہے " (مسند احمد) " اس سورت میں ایک آیت ہے جو تمام آیتوں کی سردار ہے اور وہ آیۃ الکرسی ہے ۔ جس گھر میں سورہ بقرہ پڑھی جائے وہاں شیطان داخل نہیں ہو سکتا " (ترمذی) رسول اللہ صلعم نے ایک چھوٹا سا لشکر ایک جگہ بھیجا اور اس کی سرداری آپ نے انہیں دی جنہوں نے عرض کیا تھا کہ " مجھے سورہ بقرہ یاد ہے " (نسائی) رسول اللہ صلعم نے فرمایا " سورہ بقرہ سیکھو اس کا سیکھنا برکت ہے اور اس کا چھوڑنا حسرت ہے اس کی طاقت باطل والوں میں نہیں " (صحیح مسلم) حضرت خالد بن معدان سورہ بقرہ کو قرآن کا خیمہ کہا کرتے تھے ۔ ابن مردویہ میں ہے کہ جب حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے اصحاب میں کچھ سستی دیکھی تو انہیں یا اصحاب سورۃ البقرہ کہہ کر پکارا ۔ غالباً یہ حنین والے دن کا ذکر ہے ۔ جب لشکر کے قدم اکھڑ گئے تھے تو حضورؐ کے حکم سے حضرت عباسؓ نے اے درخت والو یعنی اے بیعت الرضوان کرنے والو اور اے سورہ بقرہ والو کہہ کر پکارا تھا تاکہ انہیں خوشی ہو اور ان میں دلیری پیدا ہو ۔ چنانچہ اس آواز کے ساتھ ہی صحابہؓ ہر طرف سے دوڑ پڑے ۔ جس قدر احکام شرعیہ سورہ بقرہ سے مستفاد ہیں اور کسی سے نہیں ۔ اگرچہ اس سورۃ میں بہت عمدہ مضامین اور طرح طرح کی ہدایت افزا باتیں ہیں مگر چونکہ گائے کے ذبح کرنے کا حکم بنی اسرائیل میں واقعہ ہوا تھا اس لئے اس کا نام سورہ بقرہ ہوا ۔ بقر اور بقرۃ گائے بیل ، مذکر مونث دونوں پر اطلاق کئے جاتے ہیں ۔ سورہ بقرہ کا نام عہد رسالتؐ میں مشہور ہو چکا تھا جیسا کہ احادیث صحاح ستہ سے معلوم ہوتا ہے ۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم میں سے جو شخص سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران جانتا تھا اس کی بڑی عزت و عظمت ہوتی تھی ۔ (مسلم شریف)

مدینہ منورہ میں یہود و نصاریٰ اور عبداللہ بن ابی بن سلول ۔ ان تینوں فرقوں کی کج بحثیوں کی اصلاح اور ان کے شکوک و شبہات کے ازالے کے لئے وضاحت و نصیحت حکمت الٰہی تھی اسی وجہ سے مدینہ پہنچتے ہی خلاق اکبر نے سورہ بقرہ کا نزول شروع فرمایا اور اس میں لوگوں کی اصلاح و درستی کو ملحوظ رکھا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " سورہ بقرہ سنام القرآن اور ذروۃ القرآن

ہے۔ (شام اور قدرو ہر چیز کے اعلیٰ و افضل حصہ کو کہا جاتا ہے) اس کی ہر آیت کے نزول کے وقت ۸۰ فرشتے اس کے جلو میں اترے ہیں۔ (مسند احمد) حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ "سورہ بقرہ کی دس آیتیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کو رات میں پڑھ لے تو اس رات کو جن شیطان گھر میں داخل نہ ہوگا اور اس کو اور اس کے اہل و عیال کو اس رات میں کوئی آفت، بیماری، رنج و غم وغیرہ ناگوار چیز پیش نہ آئے گی۔ اگر یہ آیتیں کسی مجنون پر پڑھی جائیں تو اس کو افاقہ ہو جاتا وہ دس آیتیں یہ ہیں۔ سورہ بقرہ کی ابتدائی چار، درمیانی تین آیتیں یعنی آیۃ الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیتیں، پھر آخر سورہ بقرہ کی تین آیات۔ فضائل کے اعتبار سے بھی سورہ بقرہ کا امتیاز نمایاں ہے۔ حضرت فاروق اعظمؓ فرماتے ہیں۔ جب میں نے سورہ بقرہ کو تفسیر کے ساتھ پڑھا تو اس کی تعلیم میں ۱۲ سال خرچ ہوئے۔ اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے یہ سورت آٹھ سال میں پڑھی (قرطبی) سورہ فاتحہ میں تین اہم مضامین ملتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت یعنی پروردگار عالم ہونے کا بیان۔ اللہ تعالیٰ کا مستحق عبادت ہونا اور اس کے سوا کسی کا لائق عبادت نہ ہونا اور طلب ہدایت یعنی اھدنا الصراط المستقیم۔ اگر غور کیا جائے تو پورا قرآن ایک انسان کا جواب ہے کہ وہ جس صراط مستقیم کا متلاشی ہے وہ قرآن ہی میں ہے۔ حضور رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ کے یہود و نصاریٰ کو دعوت اسلام دی تو یہود علیہم الغضب اپنی عظمت و جلال کے جھوٹے سہارے پر تکبر دکھانے لگے۔ کیونکہ ان کا خود ساختہ و فرضیہ پرستی کے تصور راسخ تھے دین کے قبول اور اکثریت نے رسول کی اطاعت کا انکار۔ دین اسلام قبول کرنے کے سلسلے میں یہود کے سامنے آنا وغیرہ ان کا بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید کا یہ کام تھا کہ ان رکاوٹوں کو دور کرے اور ان غلط و غیر حقیقی چیزوں کو بیہودہ قرار دے اس لئے سورہ بقرہ نازل کی گئی آیات ان کی اصلاح کے لئے وقف ہیں۔ الغرض یہ کثرت احکام الہیٰ وغیرہ ان کا اور جب حق کا معاملہ ہے اپنی قوت کے طور پر ابھر آنے کا باعث اسی تنظیم کی ضرورت تھی کہ کثرت و وحدت میں کھو جائے تاکہ بدنظمی کو قدم جمانے کا موقع نہ رہے۔ ایسا قانون درکار تھا جو قرآن اور قوم اور ان کے حقوقات کا واضح منصفانہ فیصلہ کرسکے۔ ایسا اقتصادی نظام جس میں تمام آسودگی کی ضمانت ہو۔ سیرت و اخلاق کا ایسا سانچہ جس میں ڈھل کر خوبیاں اور نیکیاں اخلاقی رنگ اختیار کرلیں اور ایسے آئین کی ضرورت جس پر نظام سیاست کی بنیاد و قیام کا دارومدار ہو سورہ بقرہ میں ان تمام ضروریات اور مطالبات کے لحاظ سے اکثر قواعد و ضوابط ملتے ہیں جو قانون، اخلاق، آئین اور سیاست کے شعبوں میں کا حصہ نمایاں کرتے ہیں۔ عبادات، تعلیم، قصص اور دیگر کئی اہم امور و مسائل پر احکام وغیرہ اس سورہ کے خصائص میں ہے۔ ان تمام باتوں کے لحاظ سے مطالعہ زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے (۱۲) ہم ہم

الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

الٓمّٓ ۝ یہ وہ (رفیع الشان) کتاب (قرآن حکیم) ہے جس میں کوئی بھی شک نہیں ہے، پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے

الف لام میم حروف مقطعات ہیں۔ قرآن مجید کی ۲۹ سورتوں کی ابتدا ایسے ہی حروف مقطعات سے ہوتی ہے۔ سورہ بقرہ کا آغاز بھی حروف مقطعات سے ہوتا ہے کتب تفسیر میں ہے کہ ان میں کا ہر حرف الگ الگ ساکن پڑھا جاتا ہے۔ الٓمّٓ اور دیگر حروف مقطعات اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلعم کے درمیان راز ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں ان پر ایمان لانا اور ان کی تلاوت کرنی چاہیے حروف مقطعات کے معنوی فوائد و برکات ہمیں پہنچتے ہیں۔

علامہ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہاں ذٰلِكَ معنی میں ھٰذا کے ہے یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کے قائم مقام عربی زبان میں اکثر آتے رہتے ہیں۔ زمخشری کہتے ہیں اس سے اشارہ الٓمّٓ کی طرف ہے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے اشارہ قرآن کریم کی طرف ہے جس کے آنے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ ہوا تھا" حضرت مولانا عبد الحق حقانیؒ کہتے ہیں "اللہ تعالیٰ نے ھٰذا نہیں فرمایا بلکہ ذٰلِكَ فرمایا ہے اس میں کتاب یعنی قرآن حکیم کی عظمت و عزت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جب اعلیٰ درجہ میں کوئی شئے ہوتی ہے اور کمال کے آخر درجہ پر جا پہنچتی ہے تو اس اعتبار سے وہ دور اور نہایت بلند متصور ہو کر ذٰلِكَ سے اس کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ الکتاب میں جو الف لام ہے اس سے وہ کتاب مراد ہے کہ جس کا پہلے انبیاء علیہم السلام کی معرفت وعدہ کیا گیا تھا جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ (آنے والے زمانہ میں) خدا مجھ سا نبی برپا کرے گا اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالے گا (یعنی اس پر کتاب نازل کرے گا) یعنی قرآن (توریت سفر استثناء باب ۱۸) عرف شرع میں کتاب سے مطلقاً قرآن مجید مراد ہوتا ہے" تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ "مفسرین صحابہؓ کے نزدیک ریب کے معنی شک و شبہ ہیں ابن ابی حاتمؒ فرماتے ہیں قدماء اور متاخر مفسرین میں اس بارے میں اختلاف نہیں۔ بعض شعراء نے اس لفظ کو تہمت اور حاجت کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔ اس طرح لا ریب فیہ کے معنی واضح ہیں کہ اس قرآن کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہونے میں کچھ شک نہیں" تیسیر القرآن میں اس کے تحت لکھا ہے "اس (یعنی قرآن حکیم) کے واضح دلائل، اس کی روشن تعلیمات، اس کے بیان کردہ تاریخی واقعات اور اس کی پیشین گوئیاں حق و صداقت کے وہ شاہکار ہیں جہاں شک و شبہ کا گزر نہیں، لہٰذا اگر کوئی شبہ کرتا ہے تو یہ اس کی اپنی کج فہمی اور کور ذوقی ہے" هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کی تفسیر میں ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ اور دیگر صحابہؓ سے مروی ہے کہ ہدایت سے مراد نور ہے اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں متقین وہ ہیں جو ایمان لا کر شرک سے دور رہ کر حق تعالیٰ کے احکام بجا لائیں

متقین کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو ہدایت فرمایا۔ صاحب معارف القرآن کہتے ہیں کہ "مخصوص ہدایت
جو نجات آخرت کا ذریعہ بنے وہ متقین ہی کا حصہ ہے اگرچہ کہ قرآن کی ہدایت نہ صرف نوع بشر
کے لئے بلکہ تمام کائنات عالم کے لئے عام ہے۔ اس جگہ ہدایت خاصہ کا ذکر ہے اس لئے متقین کی
تخصیص کی گئی ہے" علامہ مفتی احمد یار خان نعیمیؒ نے نورالعرفان میں بیان کیا ہے کہ "متقی کے معنی ہیں ڈرنے
والے بچنے والے یعنی اللہ سے ڈرنے والے اور برے عقائد اور برے اعمال سے بچنے والے۔ یہاں متقین
سے مراد صحابہ کرام ہیں یعنی یہ جو متقی تمہیں نظر آ رہے ہیں وہ اسی قرآن کی ہدایت سے متقی بنے ہیں۔
سمجھ لو کہ قرآن کیسا (عظیم الشان ہدایت دینے والا کلام) ہے" (تفسیر نورالعرفان) صحابہؓ کا تقویٰ قرآن
کی حقانیت کی دلیل ہے" خاص متقین کے لئے ہدایت کے ضمن میں علامہ حقانیؒ نے جو نکتہ بیان فرمایا،
تفسیر حقانی میں قابل ملاحظہ ہے" یہ عجیب نکتہ اعجاز قرآنی کے لئے نہایت معقول ہے اور وہ یہ کہ متقین سے
مراد عام مکلفین ہیں مگر دو وجہ سے بلفظ متقین ان کو تعبیر کیا ایک یہ کہ تفاول (قرآنی)
منظور ہے جس طرح کسی مبتدی طالب علم کو اس لحاظ سے کہ یہ آئندہ عالم ہونے والا ہے "مولوی" کہہ دیتے
ہیں اسی طرح قرآن کی طرف متوجہ ہونے والے کو باعتبار مآل متقی کہہ دیا کہ جس سے یہ بات مستفاد ہوئی
کہ آخر کار قرآن کی طرف متوجہ ہونے کا نتیجہ متقی ہونا ہے۔ بخلاف اور کتب واہیہ کے کہ ان سے یہ نتیجہ
حاصل ہونے کی امید ہی نہیں بس گویا اس لفظ سے قرآن کا اشتہار دے کر طالب کو خوشخبری اور مژدہ دینا ہے
دوسرے یہ کہ گو ہر شخص کا نفع اور سعادت اس کتاب سے متصور ہے مگر
دراصل اس سے وہی فائدہ اٹھاتے ہیں جو ازلی استعداد اور صلاحیت رکھتے ہیں اور جو بدبخت ازلی ہیں
وہ اس سے محروم ہیں۔ اس لفظ متقین سے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ جو بدبخت ازلی ہیں وہ نہیں مانتے
اس میں نکتہ چینیاں کرتے ہیں سو وہ اس کتاب کا قصور نہیں ہے بلکہ ان کی استعداد میں فتور ہے"
ترجمان القرآن میں ھدی للمتقین کے تحت لکھا ہے" یہ کتاب متقی انسانوں پر فلاح و سعادت
کی راہ کھولنے والی ہے اور قبولیت حق کے لحاظ سے انسانوں کی پہلی قسم وہ ہے جن کی طبیعت محتاط ہوتی ہے!
ہر بات میں سمجھ بوجھ کر قدم اٹھاتے اور اچھے برے، نفع و نقصان، نشیب و فراز کا خیال رکھتے ہیں
برائی کو چھوڑ دیتے اور اچھائی کو اختیار کرتے ہیں" ان کے برخلاف دوسری قسم ان کے بالکل برعکس ہوتی ہے
قرآن تعبیر کے لحاظ سے" متقی یعنی ایسا آدمی جو اپنے فکر و عمل میں بے پروا نہیں ہوتا۔ ہر بات کو
درستگی کے ساتھ سمجھنے اور کرنے کی کوشش رکھتا ہے، برائی اور نقصان سے بچنا چاہتا اور اچھائی
اور فائدے کی جستجو رکھتا ہے۔ قرآن فرماتا ہے کہ ایسے ہی لوگ تعلیم حق سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں
اور کامیاب ہو سکتے ہیں"

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ ۙ

وہ جو ایمان لاتے ہیں غیب پر اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو ہم نے انہیں روزی دی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں

اس آیت مطہرہ میں ایمان، نماز اور انفاق کا بیان ہے یہ سب متقین کی صفات ہیں جن کو ہدایت بخشنے والی ذی شان کتاب مبین قرآن مجید ہے۔ سورہ بقرہ کی دوسری اور تیسری آیت ایک دوسرے سے مربوط اور متعلق ہیں۔ اس ارشاد خداوندی کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر نے فرمایا ہے "حضرت ابن عباسؓ "ایمان، تصدیق کو کہتے ہیں"۔ حضرت زہریؒ کے پاس "ایمان عمل ہے"۔ ربیع بن انس کے نزدیک "خوف خدا کا دل میں پیدا ہونا ایمان ہے"۔ جبکہ ابن جریرؒ کا کہنا ہے کہ "یہ سب ایک ہی معنی دیتے ہیں یعنی زبان سے، دل سے اور عمل سے غیب پر ایمان لانا اور خوف خدا رکھنا"۔ اللہ تعالیٰ پر اس کی کتابوں پر اس کے رسولوں پر ایمان لانا اور اس اقرار کی تصدیق عمل کے ساتھ کرنا "ایمان" ہے۔ لغت کے اعتبار سے اس کا معنی سچا مان لینا ہے قرآن میں بھی اس معنی میں آیا ہے۔ اسی طرح ایمان یقین کے معنی میں اس وقت آتا ہے جب اس کا ذکر اعمال کے ساتھ ہو جس وقت اس کا استعمال مطلق ہو تو ایمان شرعی جو اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہے وہ اعتقاد، قول اور عمل کے مجموعہ کا نام ہے اکثر ائمہ کا یہی مسلک ہے۔ ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ و بعض دیگر اصحاب کے پاس الغیب سے مراد وہ پوشیدہ چیزیں ہیں جو نظروں سے اوجھل ہیں جیسے جنت، دوزخ وغیرہ وہ امور جو قرآن میں مذکور ہیں۔ ابن عباسؓ یہ فرماتے ہیں کہ خدا کی طرف سے جو آیا ہے وہ سب غیب میں داخل ہے۔ حضرت ابو ذرؓ نے بیان اس کا مفہوم قرآن مجید۔ عطا بن ابو رباحؒ کے پاس "اللہ پر ایمان لانے والا غیب پر ایمان لانے والا ہے"۔ اسی طرح مفسرین کے پاس الغیب سے مراد "قرآن" ہے۔ "اللہ پر ایمان لانے والا غیب پر ایمان لانے والا ہے"۔ اس سے مراد اسلام کی جملہ پوشیدہ چیزیں بھی ہیں اور اللہ پر ایمان لانا بھی ہے۔ تفسیر ابن مردویہ میں ہے کہ حضرت صالح بن جبیرؓ حضرت ابو جمعہ انصاریؓ سے نقل فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہؓ نے دریافت کیا "یا رسول اللہ! کیا ہم سے بہتر اجر کا مستحق بھی کوئی ہوگا؟ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور آپ کی تابعداری کی"۔ آپ نے فرمایا "تم کیوں نہ کرتے، خدا کا رسول تم میں موجود ہے۔ وحی خداوندی آسمان سے تمہارے سامنے نازل ہو رہی ہے۔ ایمان تو ان کا ہے جو تمہارے بعد آئیں گے کہ دو جلدوں کے درمیان لکھا پائیں گے اور اس پر ایمان لائیں گے اور عمل کریں گے۔ یہ لوگ اجر میں تم سے دو گنے ہیں"۔ (ابن کثیر)

[illegible]

مولانا ابو الکلام آزاد رقم طراز ہیں "انسان کے علم و ادراک کا ذریعہ اس کے حواس ہیں جو کچھ ان کے ذریعہ معلوم کر سکتا ہے اس کے لئے محسوس ہے اور جو معلوم نہیں کر سکتا غیر محسوس ہے۔ قرآن نے اس مطلب کے لئے غیب اور شہادۃ دو لفظ استعمال کئے ہیں۔ عالم غیب یعنی غیر محسوسات اور عالم شہادت یعنی محسوسات۔ فرمایا۔ خدا پرستی کی بنا اس پر ہے کہ ان حقائق پر یقین رکھے جو اگرچہ اس کے لئے غیر محسوس و مستور ہیں لیکن وجدان ان کی شہادت دیتا ہے اور وحی نے ان کی خبر دی ہے۔ (ترجمان القرآن ۲۳۶)

اور اصطلاحِ شرع میں خبرِ رسول ﷺ کو بغیر مشاہدہ کے محض رسول کے اعتماد پر یقینی طور پر مان لینے کا نام ایمان ہے۔ لغوی طور پر غیب ایسی چیزوں کو کہا جاتا ہے جو نہ بدیہی طور پر انسان کو معلوم ہوں، اور نہ انسان کے حواسِ خمسہ اس کا پتہ لگا سکیں۔ قرآن مجید میں لفظ غیب سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اور ان کا علم بداہتِ عقل اور حواسِ خمسہ کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات بھی آ جاتی ہیں، تقدیری امور، جنت و دوزخ کے حالات، قیامت اور اس میں پیش آنے والے واقعات بھی، فرشتے، تمام آسمانی کتابیں اور تمام انبیاء سابقین بھی جن کی تفصیل اسی سورہ بقرہ کے ختم پر "آمن الرسول" میں بیان کی گئی ہے۔ گویا یہاں ایمان مجمل کا بیان ہوا ہے اور آخری آیت میں ایمان مفصل کا۔ تو اب ایمان بالغیب کے یہ معنی ہو گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہدایات و تعلیمات لے کر آئے ہیں ان سب کو یقینی طور پر دل سے ماننا، شرط یہ ہے کہ اس تعلیم کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہونا قطعی طور پر ثابت ہو۔ جمہور اہل اسلام کے نزدیک ایمان کی یہی تعریف ہے۔ (عقائد طحاوی و عقائد نسفی) اس تعریف میں ایمان ماننے کا نام ہے، محض جاننے کو ایمان نہیں کہتے۔ کیونکہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے وہ تو ابلیس شیطان اور بہت سے کفار کو بھی حاصل ہے کہ ان کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صدق کا یقین تھا مگر اس کو مانا نہیں اس لئے وہ مومن نہیں۔" (ملخص از معارف القرآن)

یقیمون الصلوٰۃ اقامت یعنی سیدھا کھڑا کرنا یعنی تعدیل ارکان اور نہایت خشوع و خضوع اور حضورِ قلب سے نماز ادا کرنا۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں نماز کو لفظ اقامت سے تعبیر کیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ نماز پڑھنا اور چیز ہے اور اس کا قائم کرنا اور بات ہے۔ (تفسیر حقانی) رزق در حقیقت حصہ و بخشش خواہ حسی ہو یا معنوی کا نام ہے۔ اس لحاظ سے مال، اولاد، علم و معرفت سب رزق ہیں۔ اس آیت میں بھی رزق کا یہی مطلب ہے، مال و دولت، رشتہ و پیوند، علم و عرفان وغیرہ جو چیز ہے کسی کی نہیں سب اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی بھی اسی میں ہے کہ جو ان نعمتوں سے محروم ہیں ان میں تقسیم کرتا رہے۔ دولت مند اپنی دولت سے، عالم اپنے علم سے اور عارف (ولی) اپنے روحانی فیض و برکت سے مستحقین کو مالا مال کرے۔ اور یہی صفات متقین کی تیسری علامت ہے۔ (ضیاء القرآن) حواس و واسطۂ تجربہ و مشاہدہ میں نہ آنے والے حقائق یعنی ذات و صفات الٰہیہ، فرشتے، وحی، جہنم و جنت وغیرہ پر یقین حق کا ذریعہ خبرِ رسول ﷺ ہے۔ ایمان بالغیب ہے۔ اطاعت کی علی الاعلان اور دائمی صورت نماز کا قائم کرنا اور اللہ تعالیٰ کی عطا میں سے حقوق کی ادائیگی کے لئے اور مزید حصولِ رضائے حق تعالیٰ کے لئے خرچ کرنا متقین کی صفات اور پہچان ہے۔

وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ

اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

سورہ بقرہ کی تیسری آیت مبارکہ جس میں متقین کے اوصاف حمیدہ سے متعلق اہم بیان فرمائے گئے ہیں یعنی ایمان، نماز اور انفاق جن کے شعور اس آیت کے پہلے حصے میں الذین یومنون بالغیب سے متعلق ارشاد ہے اور اس کے بعد ہی نماز اور انفاق سے متعلق فرمان حق تعالیٰ ہے۔ "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ویقیمون الصلوٰۃ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے فرائض نماز بجا لاتے ہیں رکوع سجدہ تلاوت خشوع اور توجہ کو قائم کرتے ہیں۔ قتادہؒ فرماتے ہیں وقتوں کا خیال رکھنا، وضو اچھی طرح کرنا، رکوع سجدہ پوری طرح کرنا اقامت صلوٰۃ ہے مقاتلؒ کہتے ہیں وقت کی نگہبانی کرنا کامل طہارت کرنا رکوع سجدہ اطمینان سے کرنا، تلاوت اچھی طرح کرنا، التحیات اور درود پڑھنا اقامت صلوٰۃ ہے (ملاحظہ فرمائیں تفسیر ابن کثیر) نماز کا صحیح صحیح ادا کرنا متقین کی دوسری صفت ہے ضیاء القرآن میں ہے "نماز قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نماز کو تمام حقوق ظاہری اور باطنی کے ساتھ ادا کرو۔ نماز کے ظاہری حقوق تو یہ ہیں کہ سنت نبوی ﷺ کے مطابق تمام ارکان بجا لائے جائیں۔ اور باطنی حقوق یہ ہیں کہ (نماز پڑھنے والا) خضوع و خشوع میں ڈوبا ہوا ہو اور احسان کی کیفیت طاری ہو یعنی محسوس کر رہا ہو کہ کانک تراہ گویا اپنے معبود کو دیکھ رہا ہے ورنہ کم از کم اتنا تو ضرور ہو کہ فانہ یراک کہ تیرا رب تجھے دیکھ رہا ہے۔ اس ذوق و شوق سے ادا کی ہوئی نماز ہی وہ نماز ہے جسے دین کا ستون اور مومن کی معراج فرمایا گیا ہے۔" معارف القرآن میں اقامت صلوٰۃ کے بارے میں لکھا ہے کہ اقامت کے معنی محض نماز پڑھنے کے نہیں بلکہ نماز کو ہر جہت اور ہر حیثیت سے درست کرنے کا نام ہے جس میں نماز کے تمام فرائض، واجبات، مستحبات اور پھر ان پر دوام و التزام یہ سب اقامت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اور صحیح یہ ہے کہ اس جگہ نماز سے کوئی خاص نماز مراد نہیں بلکہ فرائض و واجبات اور نفل نمازوں کو یہ لفظ شامل ہے خلاصہ مضمون یہ ہوا کہ وہ لوگ جو نمازوں کی پابندی بھی قواعد شرعیہ کے مطابق کرتے ہیں اور ان کے پورے آداب بھی بجا لاتے ہیں۔ بخاری شریف کتاب الایمان باب الصلوٰۃ میں ارشاد ربانی وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ (سورہ ۲ آیت ۱۴۳) کی تشریح میں صراحت یوں فرمائی گئی کہ نماز ایمان میں داخل ہے کیونکہ اس آیت میں ہے "اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ تمہارا ایمان (یعنی تمہاری نمازیں جو تم نے بیت المقدس کی طرف پڑھی تھیں) ضائع کر دے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب (ہجرت کرکے) مدینہ تشریف لائے تو پہلے اپنے ننھیال جو انصار تھے ان کے ہاں اترے آپ نے (مدینہ آنے کے بعد) سولہ یا سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی مگر آپ کو یہ اچھا معلوم ہوتا

تھا کہ آپ کا قبلہ کعبہ کی طرف ہو جائے (خانہ کعبہ ہو گیا) ۔ قبل تحویل (قبلہ) کے اسی قدیم قبلہ (یعنی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے
نماز پڑھنے والوں میں سے) جو لوگ مر چکے تھے ہم یہ نہ سمجھ سکے کہ ان کے متعلق کیا خیال کیا جائے اس پر
اللہ تعالیٰ نے یہ آیت "ماکان اللہ لیضیع ایمانکم" نازل فرمائی " ۔ اس سے نماز کا ایمان میں داخل ہونا ثابت ہوتا ہے۔
اس کے بعد متقین کی تیسری علامت "ومما رزقنٰھم ینفقون" کو ظاہر فرمایا گیا ہے ۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ
" اس کے معنی زکوٰۃ کا ادا کرنا فرماتے ہیں " آپ کے ایک دوسرے قول میں ملتا ہے جس کی تائید حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ
اور بعض دیگر صحابہؓ کے ارشادات سے بھی ہوتی ہے کہ " اس سے مراد آدمی کا اپنے بال بچوں کو کھلانا پلانا
ہے یہ زکوٰۃ کے حکم سے پہلے کی آیت ہے ۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں یہ آیت عام ہے زکوٰۃ ، اہل و عیال کے
خرچ اور جن لوگوں کو دینا ضروری ہو ان سب کے دینے کو شامل ہے ۔ اسی تفصیل کے بعد علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں
قرآن کریم میں نماز اور مال خرچ کرنے کا ذکر اکثر ملا جلا آتا ہے اس لئے نماز خدا کا حق اور خرچ کرنا مخلوق
کی طرف احسان ہے جس میں الغیر نفع پہنچے گا علی الترتیب اہل و عیال ، غلام ، نوکر (نزدیک) اور دور کے حقدار ہیں ۔
تمام واجب خرچ اور واجبات اور فرض زکوٰۃ اس میں داخل ہیں " حاشیہ کنز الایمان میں ہے " راہ خدا میں خرچ
کرنے سے یا زکوٰۃ مراد ہے یا مطلق انفاق خواہ فرض و واجب ہو جیسے زکوٰۃ ، نذر اور اپنا اور اپنے اہل و عیال کا
نفقہ وغیرہ خواہ مستحب جیسے صدقات نافلہ وغیرہ ۔ انفاق میں اسراف ممنوع ہے یعنی انفاق اپنے نفس پر ہو
یا اپنے اہل و عیال پر یا کسی اور پر اعتدال کے ساتھ ہو اسراف ہونے نہ پائے ۔ اس میں یہ ہدایت ملتی ہے
کہ مال اللہ تعالیٰ کی عطیہ ہے اگر اس کی راہ میں خرچ نہ کیا جائے تو خیانت ہے اور بخل نہایت قبیح ہے ۔
اس بارے میں علمائے کرام فرماتے ہیں ۔ رزق درحقیقت حصہ و بخشش خواہ جسمی ہو یا معنوی کا نام ہے اس لحاظ سے مال
و دولت ، اولاد ، علم و معرفت سب رزق ہیں ۔ آیت میں یہی مفہوم ہے اور سب اللہ تعالیٰ کی دین ہے لہٰذا اس کی رضا
کے حصول کے لئے بخل کا نہیں انفاق کا راستہ ہے ۔ دولت مند دولت سے ، عالم علم سے عارف اپنے فیض سے مستحقین کو راحت پہنچائے ۔
اور جو ایسا کرتے ہیں اور اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں وہی تو متقین کے زمرہ میں شمار ہیں ۔

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۝

اور وہ جو ایمان لاتے ہیں اس پر (اے حبیب) جو اتارا گیا ہے آپ پر اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے اور آخرت پر بھی
۲/۴
وہ یقین رکھتے ہیں

سورہ بقرہ کی یہ آیت مبارکہ پچھلی دو آیتوں سے مربوط اور سلسلہ بیان کے لحاظ سے متعلق ہے۔ متقین کی صفات میں ایمان، نماز اور انفاق کے ساتھ یہ بھی شامل ہے کہ وہ ایمان رکھتے ہیں اس پر جو نازل کی گئی (کتاب مبین) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ان تمام پر جو آپ سے پہلے نازل ہوئے (صحائف) انبیاء سابقین پر۔ ان کی اہم اور خصوصیت کا اظہار فرمایا گیا ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں (اہل ایمان) جو آخرت پر بھی (کامل) یقین رکھتے ہیں۔ علامہ ابن کثیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں "مطلب یہ ہے کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ خدا کی طرف سے لائے اور (آپ سے پہلے) کے انبیاء جو کچھ لائے وہ (اہل ایمان) ان سب کی تصدیق کرتے ہیں یہ نہیں کہ کسی کو مانیں اور کسی کا انکار کریں۔ بلکہ اپنے رب کی سب باتوں کو مانتے ہیں اور آخرت پر بھی ایمان رکھتے ہیں یعنی بعث و قیامت و دوزخ و حساب و میزان سب کو مانتے ہیں۔ قیامت چونکہ دنیا کے فنا ہونے کے بعد آئے گی اس لئے اسے آخرت کہتے ہیں۔ حضرت مجاہد کا قول ہے کہ سورہ بقرہ کی اول کی چار آیتیں مومنوں کے اوصاف کے بیان میں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک وصف دوسرے کو لازم اور شرط ہے ایک بغیر دوسرے کے نہیں ہو سکتا۔
غیب پر ایمان لانا، نماز کو قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اس وقت تک درست نہیں جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور اگلے انبیاء پر جو کتابیں اتری ہیں ان پر ایمان نہ ہو اور ساتھ ہی آخرت کا یقین کامل نہ ہو۔ جس طرح پہلی تین چیزیں بغیر پچھلی تین چیزوں کے غیر معتبر ہیں اسی طرح پچھلی تینوں بغیر پہلی تینوں کے صحیح نہیں" (ابن کثیر) علامہ ابو محمد عبد الحق حقانی فرماتے ہیں "جب یہ سورۃ نازل ہوئی (یعنی مدینہ میں) تو صاحب تقویٰ دو گروہ تھے ایک قدیم عرب جو پہلے مشرک تھے اور پھر اسلام لائے اور دوسرے اہل کتاب عبد اللہ بن سلام وغیرہ جو کہ پہلے مذہب یہود رکھتے تھے یا نصرانی تھے پھر مشرف باسلام ہوئے (ان دونوں گروہوں سے متعلق بیان ارشاد ہوا) الخ (اور پہلے کا) اول جملہ تو اول فریق کا تھا اور دوسرا دوسرے کا" ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ بات مسلم ہو گئی کہ تقویٰ اس کے بغیر تمام نہیں ہوتا کہ جب تک خدا کی تمام کتابوں پر ایمان نہ لائے (یعنی قرآن اور پہلے نازل ہونے والی تمام کتابوں کو برحق ماننے والے متقی ہیں)۔ ما انزل الیک سے مراد عام ہے خواہ وحی متلو ہو کہ جس کو جبرئیل علیہ السلام خدا کی طرف سے الفاظ مقررہ میں ادا کرتے تھے جسے قرآن کہتے ہیں خواہ وحی غیر متلو ہو کہ جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بلا توسط جبرئیل علیہ السلام یا بغیر الفاظ مقررہ نازل ہوئی یا جو کچھ انکشاف روحانی کے طور پر حضور انور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو معلوم کرایا گیا اور پھر آپ نے اس کو ارشاد فرمایا سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ وما انزل من قبلک سے مراد پہلے انبیاء علیہم السلام کے صحیفے ہیں یعنی حضرت ابراہیم و موسیٰ و داؤد و عیسیٰ علیہم السلام وغیرہم انبیاء کی کتابیں جو کہ

ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی تھیں یا جو بعض انبیاء علیہم السلام ہوئے تھے اپنی عبادتوں میں الہام کر جمع کر کے لکھوا دیا تھا۔ (تفسیر حقانی)
"ہمیں پچھلی آسمانی کتابوں پر ایمان لانا آج بھی ہر مسلمان کے لئے لازم ہے، فرق اتنا ہے کہ آج ان کتابوں پر
ایمان اس طرح ہوگا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں میں نازل فرمایا تھا وہ سب حق ہے اور اُس
زمانہ کے لئے وہی واجب العمل تھا، مگر قرآن نازل ہونے کے بعد جبکہ پچھلی کتابوں اور شریعتوں کے بعض احکام منسوخ
ہوگئے تو اب عمل صرف قرآن پر ہی ہوگا۔ (معارف القرآن) "یہ چونکہ ضروری ہے کہ متقین کی جتنی بھی بات واضح ہوگئی
کہ وہ لوگ جو انسانی اور شعوری ہدایت کے لئے آسمانی وحی کے قائل ہی نہیں یا وحی کے قائل تو ہیں لیکن بعض کو مانتے ہیں اور بعض
کا انکار کرتے ہیں وہ قرآن کی ہدایت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ نیز اس آیت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ختم نبوت
کی واضح دلیل ہے کیونکہ وحی جس پر ایمان لانا ضروری ہے وہ یا تو حضور اکرم ﷺ پر نازل ہوئی یا حضور ﷺ سے پہلے۔ (ضیاء القرآن)
علامہ محمود آلوسی نے لکھا ہے "ما انزل الیک" سے تمام قرآن پاک اور پوری شریعت مراد ہے۔ جس طرح پورے قرآن پاک
پر ایمان لانا ہر مکلف پر فرض ہے اسی طرح کتب سابقہ پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ البتہ ان کے احکام ہماری شریعت
میں منسوخ ہوگئے ان پر عمل درست نہیں۔" (حاشیہ کنز الایمان) آخرت سے مراد قبر، حشر، جنت، دوزخ وغیرہ سب کچھ ہے۔
معلوم ہوا کہ ان تمام چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس سے اشارۃً معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ آخرت پر صحیح ایمان
نہیں رکھتے صحیح ایمان مسلمانوں کو حاصل ہے اسی لئے ھم یوقنون سے حصر فرمایا گیا۔" (نور العرفان) آخرت کا
اسلام نے واضح تصور دیا ہے جس پر یقین ضروریاتِ ایمان اور لازم ہے۔ بعث (دوبارہ جلایا جانا)، برزخ،
پرسش، قیامت، جواب دہی، پل صراط، میزان، سزا و جزا، جہنم و جنت، شفاعت و مغفرت
وغیرہ حقائق اُخروی پر یقین راسخ متقین کی صفات میں سے ہے جس کا اس آیت کے آخر میں ذکر ہے
"آخرت پر ایمان لانا اگرچہ ایمان بالغیب کے لفظ میں آ گیا ہے مگر پھر صراحۃً اس لئے ذکر کیا گیا کہ یہ ایمان کا
اہم جز ہے کہ مقتضائے ایمان پر عمل کا جذبہ پیدا کرنا اسی کا اثر ہے۔ اس آیت میں بالآخرۃ کے ساتھ لفظ
یومنون نہیں بلکہ یوقنون ہے۔ کیونکہ ایمان کا مقابل تکذیب ہے اور ایقان کا مقابل شک و تردد۔ اس میں
اشارہ ہے کہ آخرت کی محض تصدیق مقصد کو پورا نہیں کرتا بلکہ اس کا ایسا یقین ضروری ہے جیسے کوئی چیز
آنکھوں کے سامنے ہو۔ متقین کی یہی صفت ہے کہ آخرت میں حق تعالیٰ کے سامنے پیشی، حساب کتاب،
پھر جزا و سزا کا نقشہ ہر وقت ان کے سامنے رہتا ہے۔ (بحوالہ معارف القرآن)

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

وہی لوگ ہدایت پر ہیں اپنے رب (کی توفیق) سے اور وہی (دونوں جہان میں) کامیاب ہیں (۲/۵)

سورہ بقرہ کی اس پانچویں آیت مبارکہ کا ارتباط پچھلی چار آیات شریفہ سے ہے۔ چنانچہ تفسیر ابن کثیر
میں ہے یعنی وہ لوگ جن کے اوصاف پہلے بیان ہوئے مثلاً غیب پر ایمان لانا، نماز قائم رکھنا، اللہ
کے دیئے ہوئے میں سے دینا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اترا ہے اس پر ایمان لانا، آپ سے پہلے جو کتابیں
اتریں ان کو ماننا اور آخرت پر یقین رکھ کر وہاں کام آنے والے نیک عمل کرنا، برائیوں اور حرام کاریوں سے
بچنا۔ (ان تمام اوصاف کے حامل) یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں جنہیں خدا کی طرف سے نور ملا ہے اور بیان
وبصیرت حاصل ہوئی ہے اور انہی لوگوں کے لئے دنیا اور آخرت میں فلاح اور نجات ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے
ہدایت کی تفسیر نور اور استقامت سے کی ہے اور فلاح کی تفسیر اپنی حاجت کو پالینے اور برائیوں سے بچ جانے سے کی ہے
علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے رب کی طرف سے نور اور دلیل اور ثابت قدمی اور سچائی اور
توفیق حق پر ہیں اور یہی لوگ اپنے پاکیزہ اعمال کی وجہ سے نجات، ثواب اور جنت کی ہمیشگی کو پانے کے مستحق ہیں اور
عذابوں سے دور ہیں۔ ابن جریر کا یہ بھی فرمانا ہے کہ دوسرے أُولَٰئِكَ کا اشارہ اہل کتاب کی طرف ہے جن کی
صفت اس سے پہلے بیان ہو چکی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ اس اعتبار سے والذین یؤمنون بما انزل الیک الخ
پہلے کی آیت سے جدا ہوگا اور مبتدا بن کر مرفوع ہوگا اور اس کی خبر اولئک هم المفلحون ۝ ہوگی۔ لیکن
پسندیدہ قول یہی ہے کہ اس کا اشارہ پہلے کے سب اوصاف والوں کی طرف ہے اہل کتاب ہوں یا عرب۔ حضرت
ابن عباس، ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور بعض صحابہ سے مروی ہے کہ یؤمنون بالغیب سے مراد عرب کے مومنین ہیں
اور اس کے بعد کے جملے سے مراد مومنین اہل کتاب ہیں۔ پھر دونوں کے لئے یہ بشارت ہے کہ یہ لوگ ہدایت اور فلاح
والے ہیں اور یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ آیتیں عام ہیں اور یہ اشارہ بھی عام ہے واللہ اعلم۔ (ابن کثیر)

علامہ حقانی نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ "پہلے کہا تھا کہ قرآن هدی للمتقین (یعنی) پرہیزگاروں
کے لئے ہدایت ہے۔ اس کے بعد پرہیزگاروں کے اوصاف بیان کر دیئے کہ وہ ایسے ایسے اوصاف حمیدہ رکھنے والے ہیں
اور یہ اوصاف قرآن سے حاصل ہوتے ہیں کیونکہ طرح طرح کے پر اثر بیانات سے قرآن نے انسان کو ان اوصاف
کا مشتاق کر دیا ہے اور جس میں یہ اوصاف ہوتے ہیں وہ ہدایت پر ہوتا ہے یہ بدیہی بات ہے۔ لہٰذا هدی للمتقین
ایک دعویٰ تھا اس کا ثبوت تقویٰ کے معنی بیان کر کے دیا جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ قرآن سے پرہیزگاری حاصل
ہوتی ہے اور پرہیزگاری خدا کی ہدایت ہے یہاں تک سعادت کا بیان تمام ہوا اور کلام مدلل ہو گیا کہ
قرآن سے ہدایت حاصل ہوتی ہے پھر ہدایت کا ثمرہ اولئک هم المفلحون سے بیان فرما دیا کہ جس کو
ہدایت خدائے تعالیٰ کی نصیب ہوتی ہے وہ فلاح دارین پاتا ہے۔ پہلے الذین کے مقابلہ میں أُولَٰئِكَ
علی هدی من ربهم لایا گیا اور جس طرح دوسرا الذین اس کا تتمہ تھا اسی طرح اس کے مقابلہ

میں تتمہ کے طور پر اولٰئک هم المفلحون ذکر کیا تاکہ بالآخرۃ هم یوقنون کی جزاء وہاں کی فلاح سن کر
سامع کا دل شاد شاد ہو جائے۔ جس طرح بالآخرۃ هم یوقنون میں ایمانداری کا ان پر حصر کیا تھا اس کے بعد
فلاح کا بھی ھم ضمیر مقدم کر کے ان ہی پر حصر کر دیا جس سے معلوم ہوا کہ فلاح بھی ان ہی کا حصہ ہے کہ جو ایسے
لوگ اور ان اوصاف سے متصف ہیں اور جو ایسے نہیں ہیں وہ کیسی ہی ریاضت کریں جوگی کر راہ راست پر نہیں
کبھی فلاح کو نہیں پہنچ سکتے پنڈت پادری جو اسلام کے مقابلے میں ہیں اور اس کے برخلاف ہیں ان سے کوئی مقصود
حاصل نہ ہوگا خواہ کتنی کیسی ہی مشقت اٹھائے۔ (تفسیر حقانی) عقیدہ آخرت اور خوف خدا کے باعث انسان کی
ظاہری اور باطنی حالت صورت و سیرت میں یکساں ہو سکتی ہے یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ بالآخرۃ کے ساتھ یومنون
نہیں بلکہ یوقنون فرمایا گیا ہے کیونکہ ایمان کا مقابل تکذیب اور ایقان کا مقابل شک و تردد۔ خلاصہ
یہ ہوا کہ جو حرام مال کھانے کھانے یا اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے خلاف شرع ذرائع کا اختیار کرنے والا خواہ
زبان سے آخرت پر ایمان لانے کا اقرار کرنے والا شریعت میں مومن ہوگا لیکن جس ایقان کا مطالبہ کرتا ہے وہ
اسے حاصل نہیں اور وہی انسان کی زندگی میں انقلاب لانے والی چیز ہے اسی کے نتیجہ میں متقین کو ہدایت اور کامیابی
کا انعام دیا گیا۔ (بحوالہ معارف القرآن) ابتدائی آیات میں بیان کردہ صفات سے متصف لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں
فلاح وہ مکمل کامیابی ہے جس کے دامن میں دنیا و آخرت کی ساری سعادتیں اور برکتیں سمٹ آتی ہیں۔ لفظ فلاح دارین کی
خیرات و برکات پر دلالت کرتا ہے۔ (بحوالہ ضیاء القرآن) نتیجتاً یہی لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کے (ٹھہرائے) راستے پر
ہیں اور یہی ہیں (دنیا و آخرت میں) کامیابی پانے والے (ترجمان القرآن)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ٥ ٢/٦

بے شک جنہوں نے کفر اختیار کر لیا ہے ان کے لیے برابر ہے کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

سورہ بقرہ کی ابتدائی پانچ آیات میں قرآن حکیم کے کلام حق اور کتاب ہدایت ہونے کے اظہار و اعلان کے بعد اس ہدایت کا ذکر فرمایا گیا جو اس کتاب عظیم سے جادۂ حق اور ہدایت کا صدر پاتے ہیں جنہیں قرآن پاک نے متقین سے متعارف فرمایا۔ اور ان کی چھ خصوصی اوصاف کی وضاحت فرما دی۔ یعنی ایمان، اقامت نماز انفاق فی سبیل اللہ، قرآن مجید اور صحائف سابقہ پر ایمان ونیز آخرت پر یقین کامل۔ یقیناً وہی متقین ہیں جو ان چھ اوصاف کے حامل ہیں اور وہ جو ان چھ شرائط کی تکمیل نہیں کرتے اور ان پر یقین سے عاری ہیں درحقیقت محروم ہدایت قرآنی ہیں۔ اس آیت شریفہ میں انہی بدنصیبوں کا ذکر ہے جنہوں نے کفر اختیار کر لیا ہے کفر کے معنی چھپانے کے ہیں۔ اصطلاح شریعت میں جن چیزوں پر ایمان لانا فرض ہے ان سب کا یا ان میں سے کسی چیز کے انکار کا نام کفر ہے۔ یہاں کفر کرنے والوں کے محروم ایمان رہنے سے متعلق اس حقیقت کا انکشاف ہو گیا ہے کہ وہ ڈرائے جائیں یا نہ ڈرائے جائیں بہرحال وہ اس نعمت عظمیٰ سے محروم ہی رہیں گے یعنی ایمان نہیں لائیں گے۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کو اس بات کی حرص تھی (خواہش) تھی کہ تمام لوگ ایماندار ہو جائیں اور ہدایت کو قبول کر لیں لیکن پروردگار نے فرما دیا کہ یہ سعادت ہر کے حصہ کی نہیں۔ یہ نعمت بٹ چکی ہے جس کے حصہ میں آئی ہے وہ آپ کی مانے گا اور جو بدقسمت ہے وہ ہرگز ہرگز اطاعت کی طرف نہ جھکے گا۔ تفسیر حقانی میں لکھا ہے کہ کافر اور مشرک سے مراد ازلی کافر اور ازلی شقی ہیں گو بالفعل اس شخص طرح طرح کی برائیوں اور انواع و اقسام کے کفر و شرک میں مبتلا ہے مگر ازل میں وہ نور الٰہی سے حصہ پا چکا ہے تو اس کو ضرور قرآن سے ہدایت ہوگی اور وہ ایمان بھی لاوے گا اور اچھے اعمال بھی کرے گا اور جو ازل میں اس نور سے محروم رہا وہ یہی انجام کار محروم ہی رہے گا اس کو قرآن اور حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وعظ و پند سے کچھ نفع نہ ہوگا اس لئے کہ اس میں سرے سے صلاحیت ہی نہیں۔ تفسیر نعیمی میں ہے کفروا سے وہ لوگ مراد ہیں جو علم الٰہی میں کافروں کی فہرست میں آچکے انہیں تبلیغ فائدہ نہیں دے سکتی کیونکہ کوئلہ دھونے سے سفید نہیں ہو سکتا "نجس العین" کو پانی پاک نہیں کر سکتا۔ علیھم سے معلوم ہوا کہ ڈرانا نہ ڈرانا انہیں برابر ہے آپ کیلئے برابر نہیں وہ تبلیغ سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے مگر آپ کو تبلیغ کا ثواب بہرحال ملے گا اس لئے علیک نہ فرمایا جس کے ایمان سے ناامیدی ہو اسے بھی تبلیغ کی جائے اجر ملے گا۔

صاحب معارف القرآن بیان کرتے ہیں کہ انذار کے معنی ایسی خبر دینا جس سے خوف پیدا ہو جیسا کہ بشارت ایسی خبر دینے کو کہتے ہیں جس سے سرور پیدا ہو۔ اردو میں اس کا ترجمہ ڈرانے سے کیا جاتا ہے مگر "مطلقاً" ڈرانے کو انذار نہیں کہتے بلکہ ایسا ڈرانا جو شفقت و رحمت کی بنا پر ہو جیسے اولاد کو آگ سے، زہریلے جانوروں اور درندوں سے ڈرایا جاتا ہے اسی لئے چور ڈاکو یا ظالم کسی انسان کو ڈراتے دھمکاتے ہیں اس کو انذار اور ان

قرآن کو نذیر نہیں کہا جاتا۔ انبیاء کے نذیر کا مقصد ہے کہ وہ ازراہِ شفقت پیش آئندہ معاملات سے ڈراتے ہیں اس سے
مقصود ہے کہ مصلح مبلغ مخاطب کے ساتھ ہمدردی سے گفتگو کرے۔ اس میں اس کی خیر خواہی کا جذبہ رہے۔ محض
ایک پیغام پہنچا دینا مقصود نہ ہو۔ اس آیت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تسلی کی خاطر فرمایا گیا کہ یہ ضدی اور معاند کفار
جو حقیقت کو سننا پسند نہیں کرتے اور کفر و انکار پر مصر ہو رہے ہیں ان کی اصلاح اور ایمان کے لئے جو آپ کوشش فرماتے ہیں ان کے لئے
غیر موثر ہے"۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ قرآن کا جب ظہور ہوا تو قبولیتِ حق کی استعداد کے لحاظ سے تین طرح کے
انسان گروہ تھے ۱۔ خدا پرست اور طالب حق ۲۔ عام مشرکین عرب جن کے پاس ایمان و خدا پرستی کی کوئی تعلیم نہ تھی
۳۔ اہل کتاب یعنی الہامی تعلیمات کے پیرو (یہود و نصاریٰ) جو تورات و انجیل کو کتاب الٰہی مانتے تھے
با وصف ایمان اور خدا پرستی کی حقیقت کو کھو بیٹھے تھے۔ اور اعتقاد و عمل کی تمام سچائیوں سے محروم ہو گئے تھے۔
قرآن فرماتا ہے۔ پہلا گروہ میری تعلیم سے فیض یاب ہوگا۔ دوسرا ماننے والا نہیں (یہاں انہی سے متعلق گفتگو
ہو رہی ہے) تیسرا گروہ اگرچہ ایمان کا مدعی ہے مگر فی الحقیقت ایمان نہیں رکھتا۔ ضیاء القرآن میں یہ مراد ہے کہ
کتاب الٰہی کی روشنی نے حق اور باطل کو بالکل جدا کر دیا اور نبی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا۔ جو راستہ دلائل
کے باوجود باطل کو چھوڑ کر ہدایت کو قبول کر لینے پر آمادہ نہ ہوا اور گمراہی پر رہا ایسے کو سمجھانا واقعی بے سود ہے۔ سمجھنے
والا سمجھ جاتا ہے جو سمجھ کر بھی نہ سمجھنے پر بضد ہو تو وہ مریض لاعلاج ہے اسے شفا نہیں۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان
کے اس مخصوص گروہ کی نفسیاتی حالت کا تجزیہ کیا ہے جو محض تعصب اور ہٹ دھرمی کے باعث دانستہ کفر کی راہ پر
دوڑے چلے جا رہے تھے یہاں جبر و قہر کا احتمال ہی نہیں کہ اس بحث میں الجھا جائے۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۧ

مہر لگا دی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے ۲/۷

اس آیت میں سمعھم پر پورا وقف ہے اور علیٰ ابصارھم غشاوۃ الگ پورا جملہ ہے۔ اس سے
یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ختم اور طبع دلوں اور کانوں پر ہوتا ہے اور غشاوت یعنی پردہ
آنکھوں پر پڑتا ہے۔ شروع سورت کی چار آیتوں میں مومنین کے اوصاف بیان ہوئے ہیں پھر
ان دو آیتوں میں (یعنی ان الذین الخ اور ختم اللہ الخ) کفار کا حال بیان ہوا ہے۔ حضرت سدیؒ
کے پاس ختم سے مراد طبع ہے یعنی مہر کر دینا۔ قتادہؒ فرماتے ہیں ان (یعنی کفار) پر شیطان غالب آ گیا
وہ اس کے مطیع ہو گئے۔ یہاں تک کہ مہر خداوندی ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر لگ گئی اور آنکھوں پر پردہ
پڑ گیا۔ ہدایت کو نہ دیکھ سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں۔ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ امت کا اجماع ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے
اپنی ایک صفت مہر کرنا بھی بیان کی ہے جو کفار کے کفر کا بدلہ ہے۔ (ابن کثیر) مہر (قلوب و کانوں پر) کرنے سے
اور آنکھوں پر پردہ ہونے سے یہ مراد نہیں کہ درحقیقت خدا تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر اس طرح
سے مہر لگا دی ہے کہ جس طرح کسی برتن کا منہ بند کر کے اس پر لاکھ سے اس لئے مہر لگا دیتے ہیں کہ اس کے
اندر اور کوئی چیز نہ جانے پاوے نہ اندر کی چیز باہر آنے پاوے یا بیچ میں کوئی ٹاٹ یا ترپال کا پردہ
آنکھوں پر ڈال دیا ہے بلکہ اس سے مراد وہ جبلی کجروی اور طبعی تاریکی ہے کہ جس کی وجہ سے کفر و
معصیت کی طرف بے خود ہو کر دوڑتا ہے اور امور فطرت سے اس کو ذاتی نفرت ہوتی ہے۔ یہ ایک حالت
ہے جس کو خدا نے استعارہ کے طور پر ختم اور غشاوۃ سے تعبیر کیا ہے۔ اس ضمن میں یہ نکتہ ملحوظ رہا
کہ ختم اللہ الخ یہ اس دعوے کی (کہ ان پر ہدایت کا کچھ اثر نہ ہوگا وعظ کرنا نہ کرنا برابر ہے) دلیل ہے
اور یہ دلیل اس لئے بیان ہوئی ہے کہ کفار پر اس دعوے کا ثبوت سمجھ میں نہیں آتا تھا اس کے ثبوت میں
فرمایا گیا ہے اس لئے کہ خدا تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ
پڑا ہے یعنی ان کی جبلت تاریکی میں ہے اور بہیمیت کی اندھیریوں نے ان کو ہر طرف سے محیط ہو کر اس
اس امر کے قابل ہی نہیں رکھا۔ جب یہ دلیل بیان ہو چکی تو بعد میں اس پر جو اثر مرتب ہونے والا ہے
وہ فرماتا ہے کہ ولھم عذاب عظیم یہ عذاب خواہ آگ سے ہو خواہ طوق و زنجیر سے خواہ
اور کسی طرح سے جس کی کیفیت ہم کو معلوم نہیں جو کچھ ہو وہ روح کی تاریکی اور اس کی جبلی کجروی
کا اثر مرتب ہے (حقانی) ان حقائق سے معلوم ہوا کہ کفر اور گناہ کی اصل سزا تو آخرت میں ملے گی
مگر بعض گناہوں کی کچھ سزا دنیا میں بھی مل جاتی ہے جو بعض اوقات اصلاح حال کی توفیق کے سلب
ہو جانے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور انسان آخرت کے حساب کتاب سے بے فکر ہو کر اپنی
نافرمانیوں اور گناہوں میں بڑھتا چلا جاتا ہے اور برائی کا احساس بھی دل سے جاتا رہتا ہے۔

(معارف القرآن) حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دلوں پر فتنے اس طرح پیش ہوتے ہیں جیسے ٹوٹے ہوئے بوریے کا ایک تنکا جو دل انہیں قبول کر لیتا ہے اس میں ایک سیاہ نکتہ ہو جاتا ہے اور جس دل پر یہ فتنے اثر نہیں کرتے اس پر ایک سفید نکتہ ہو جاتا ہے جس کی سفیدی بڑھتے بڑھتے بالکل سفید ہو کر سارے دل کو منور کر دیتی ہے۔ اور اس دوسرے دل کی سیاہی پھیلتی جاتی ہے یہاں تک کہ سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ وہ اس الٹے کوزے کی طرح ہو جاتا ہے نہ اچھی بات اسے اچھی لگتی ہے اور نہ برائی بری معلوم ہوتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ گناہوں کی زیادتی دلوں پر غلاف ڈال دیتی اور اس کے بعد مہر خداوندی ہو جاتی ہے جسے ختم اور طبع کہا جاتا ہے اب اس دل میں ایمان کے جانے اور کفر نکلنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی اسی مہر کا ذکر اس آیت ختم اللہ الخ میں ہے (ابن کثیر)

بعض کا یہ کہنا ہے کہ "جب اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی اور آنکھوں پر پردے ڈال دیے تو پھر یہ لوگ ایمان لاتے نہیں" یہاں صرف یہ ملحوظ رہے کہ اگر انسان جسمانی صحت کے اصول کو پس پشت ڈال دے تو اس کا معدہ خوش شدہ ہر چیز ہضم کر لیا کرتا تھا اگر ہضم کرنے سے معذور نہیں ہو جاتا؟ کیا اس کا جگر خون پیدا کرنا چھوڑ نہیں دیتا۔ اگر ایسا ہے تو روحانی صحت کے لیے چند اصول ہیں جن کی پابندی سے روحانی قوتیں نشوونما پاتی ہیں اور جن کی پیہم خلاف ورزیوں سے وہ قوتیں ناکارہ ہو کر رہ جاتی ہیں دل سے حق و باطل کی تمیز کرنے کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے آنکھیں دیکھتی تو ہیں لیکن عبرت حاصل نہیں کرتیں کان سنتے تو ہیں لیکن نصیحت قبول نہیں کرتے اسی کیفیت کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے"

[illegible]

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝

اور کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور روزِ قیامت پر حالانکہ وہ مومن نہیں (۲/۸)

سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات میں متقیوں اور مومنوں کے اوصاف کا ذکر ہوا پھر کفار کا حال بیان کیا گیا یہاں پر منافقین سے متعلق ذکر ہے جو بظاہر ایماندار بنتے ہیں لیکن حقیقت میں کافر ہوتے ہیں چونکہ منافقین کا حال لوگوں پر عموماً پوشیدہ رہ جایا کرتا ہے اس لئے ان کی بابت کچھ نشانیاں بیان کی گئیں ہیں نفاق دراصل باطن کے خلاف ظاہر کرنے اور برائی کو پوشیدہ رکھنے کو کہتے ہیں اس کی دو قسمیں ہیں اعتقادی اور عملی۔ پہلی قسم کے منافق تو ابدی جہنمی ہیں اور دوسری قسم کے بدترین مجرم ہیں۔ امام ابن جریج؟ فرماتے ہیں منافق کا قول اس کے عمل کے خلاف، اس کی پوشیدگی ظاہر کے خلاف، اس کا آنا جانے کے خلاف اس کی موجودگی عدم موجودگی کے خلاف ہوا کرتی ہے۔ علامہ ابن کثیر کے بموجب جنگ بدر میں شرکت دین کے ظہور اور مسلمانوں کا سکہ جم جانے کے بعد یہ نیا ایک گروہ (منافقین) قائم ہوا۔ عبداللہ بن ابی بن سلول اس گروہ کا سردار تھا۔ پروردگار عالم نے منافقوں کی بابت ان کی بد خصلتوں کا بیان ذکر فرمایا ہے تاکہ ان کے ظاہر حال سے مسلمان دھوکہ میں نہ آجائیں اور انہیں مسلمان خیال کرکے اپنا نہ سمجھ بیٹھیں علامہ عبدالحق حقانی نے اس آیت کے متعلق جو نکات بیان کئے ہیں ان میں پہلا نکتہ یہ ہے کہ منافقین دعویٰ کرتے تھے کہ ہم اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں پس خدا تعالیٰ نے بھی ان کے ادعا کے موافق باللہ وبالیوم الآخر کو خاص کیا تاکہ معلوم ہو کہ جس میں تم کو دعویٰ ہے اسی میں تم سچے نہیں کیونکہ خدا اور قیامت کے دن پر رکھتے تو اس مکر اور فریب کو خدا تعالیٰ اور اس کے رسول سے جائز نہ رکھتے اور باتوں میں تو سرے سے ایمان کا کیا اعتبار ہے یعنی جب ان میں تم کو سچائی کا دعویٰ ہے وہی جھوٹ ہو جائے گا جبکہ تم کو خود نفاق معتبر ہو۔ دوسرا نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ اگرچہ سیاق کلام یہ چاہتا تھا کہ ان کے جواب میں ما آمنوا کہا جاتا تاکہ جواب مطابق ہوتا مگر بجائے اس کے ماہم بمؤمنین فرمایا تاکہ ان سے ایمان کی نفی اچھی طرح سے ہو جائے کیونکہ زمانہ ماضی میں ان کو ایمان سے جدا کرنا جب کہ ما آمنوا سے سمجھا جاتا اس امر میں اتنا فائدہ نہیں بخشتا کہ جو ان کو ہمیشہ کے لئے ماہم بمؤمنین سے ایمان سے باہر کر دیا گیا ہے علاوہ اس کے ما آمنوا میں بمقابلہ جواب صرف اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان لانے کی نفی سمجھی جاتی اور جبکہ ماہم بمؤمنین کہا اور نفی کو باء سے موکد کر دیا تو بالکل ایمان سے بے بہرہ ہونا ثابت کر دیا کہ ان کا ایمان نہ اللہ پر ہے نہ قیامت پر نہ نبی پر اور نہ قرآن اور اس کے متعلقات پر۔ منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول کے نفاق کا سبب اس کا احساس محرومی و ناکامی تھا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ میں تشریف لانے سے پہلے تو تجویز ہو چکا تھا کہ اس کو سرداری کی پگڑی پہنا کر اس شہر کا سردار بنا دیں۔ لیکن جب حضرت تشریف لائے اور روح کو زندہ کرنے والی باتوں سے تمام جاہلیت کی تاریکیاں لوگوں میں سے دور ہو گئیں اور لوگوں کو ایک نئی زندگی کا مزہ آ گیا تو پھر ان کے اور اس دنیا پرست کی وقعت نہیں رہی۔ اس لئے اس شخص کو رسول اللہ صلعم اور مسلمانوں سے حسد اور بغض پیدا ہوا جو غلبۂ اسلام کی وجہ سے ہے۔ یہ اپنی خباثت باطنی کو ظاہر نہ کر سکا۔ اور لوگوں کے ساتھ آپ خود بھی بظاہر اسلام میں شامل رہا لیکن یہ اور اس کے رفیق در پردہ اسلام کی بیخ کنی کرتے رہے۔ منافقوں میں اسی آیت کے تحت گنا جاتا ہے۔ اسلام کی روز افزوں ترقی کو دیکھ کر دنیوی فوائد حاصل کرنے کے لئے کئی موقع شناس اپنے آپ کو مسلمان بتانے لگے تھے۔ نیز وہ جو باطن خاص طور پر کھلے طور پر اسلام کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھے وہ مسلمانوں میں شامل ہو کر سازشوں اور فتنہ انگیزیوں کا جال پھیلا کر مسلمانوں کو پریشان کرنا چاہتے۔ ہجرت سے پہلے منافقوں کا نشان نہیں ملتا کیونکہ اس وقت مسلمان بننا ہر قسم کے ظلم و ستم کا نشانہ بننا تھا۔ اس لئے کسی کو کیا پڑی تھی کہ ایسے دین کے لئے مصیبتوں کو دعوت دے جس پر اس کا ایمان نہیں۔ وہاں تو صرف وہ لوگ ہی اسلام قبول کرتے جو دل سے اللہ اور اس کے رسول پاک کے لئے جان، مال، اولاد غرضیکہ سب کچھ قربان کرنا اپنے لئے بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مسلمان وہی ہے جو زبان سے اقرار کے ساتھ دل سے تصدیق بھی کرے اور جو دل سے تصدیق نہ کرے وہ مومن نہیں ہو سکتا۔ خواہ ایمان و اسلام کے دعوے کتنے ہی چرب زبانی کیوں نہ ہو۔ (مرتب : [illegible])

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

فریب دیا چاہتے ہیں اللہ کو اور ایمان والوں کو اور (حقیقت میں) نہیں فریب دیتے ہیں مگر اپنے آپ کو (اور اس حقیقت) نہیں سمجھتے۔

"خدع۔ لغت میں کسی بات چھپانا اور اس کے برعکس دکھانا (کہ مقصد ہی ہے) تاکہ کسی کو فریب دیا جائے۔ نفس۔ ذات شے کو کہتے ہیں خواہ وہ جوہر ہو یا عرض یا دونوں سے بری جیسا کہ ذات باری تعالیٰ لقولہ تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسک (ترجمہ: جو میرے جی میں ہے تو جانتا ہے میں نہیں جانتا جو تیرے علم میں ہے) اور روح کو بھی کہتے ہیں کیونکہ حی کا نفس اسی سے قائم ہے اور قلب کو بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ محل روح ہے اور خون کو بھی کہتے ہیں کیونکہ نفس کا قوام اسی سے ہے اور پانی کو بھی کیونکہ اس کی طرف نفس کو زیادہ حاجت ہے اور رائے کو بھی کیونکہ یہ نفس سے پیدا ہوتی ہے۔ شعور۔ احساس کو کہتے ہیں اور انسان کے مشاعر اس کے حواس ہیں اور اصل اس کی شعر (بال) ہے اور جو لباس جلد کے بالوں سے ملا ہوا ہو اسی لئے عرب اس کو شعار کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے کھرا اور وسیع معانی میں بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے" اس آیت مبارکہ سے ان متعلقات کی تفصیل کے ساتھ اس کی تفسیر میں علامہ عبد الحق حقانی ؒ لکھتے ہیں "یعنی وہ منافقین جو یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اپنے زعم میں خدا تعالیٰ سے اور مسلمانوں سے فریب بازی کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ فریب اپنے تئیں دے رہے ہیں کیونکہ اللہ علام الغیوب ہے اس سے کوئی بات مخفی نہیں رہ سکتی اور وہ مومنوں کو آگاہ کرتا رہے گا اور تمام نقصان ان پر پڑے گا پس اس مخادعت (فریب بازی) کا اثر نہ پڑا اثر انہی پر پڑا کہ دنیا میں بھی رسوائی ہوئی آخرت میں عذاب شدید میں مبتلا ہوں گے مگر ان کے حواس سلیمہ میں فتور آگیا کہ ان کو یہ موٹی سی بات بھی دکھائی نہیں دیتی کہ خدا تعالیٰ کو کوئی فریب نہیں دے سکتا اس کا اثر و وبال ہم ہی پر پڑے گا۔ یہ تفسیری نکات لکھ کر ... کہ منافقین یہ فریب بازی ہمیشہ کرتے تھے اور آئندہ بھی یہ فعل ان سے متوقع تھا تو اس رمز کے مضارع سے ان کے اس حال کو تعبیر کیا تاکہ تجدد اور حدوث ہر دو آئندہ کے صدور پر دلالت کرے (۲) ان کی پرلے درجے کی حماقت کو ثابت کرنے کے لئے وما یشعرون فرمایا ما یعلمون نہ فرمایا کیونکہ شعور محسوسات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور علم محسوسات معقولات دونوں کے لئے۔ پس ما یشعرون فرمایا تو گویا یہ ثابت کردیا کہ ان میں ... ادراک محسوس چیز سے بھی محروم ہیں کہ علیٰ ابصارہم غشاوۃ یعنی ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہے وہ دیکھ نہیں سکتے۔
(تفسیر حقانی)

" اسی لئے ان (منافقین) کے دعوئ ایمان کو غلط اور جھوٹ قرار دیا گیا ہے کہ ان کا دعوی محض فریب ہے۔ یہ ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی فریب نہیں دے سکتا اور نہ ... مگر کوئی ایسا نہ سمجھتے ہوں گے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دے سکتے ہیں

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ ان کی چالبازی کو درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ چالبازی قرار دے کر فرمایا گیا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ چالبازی کرتے ہیں (قرطبی بحوالہ معارف) تفسیر عثمانی میں ہے کہ اللہ کے رسول کو دھوکہ دینا (درحقیقت) رب کو دھوکہ دینا ہے گویا کہ حضور رب کے خلیفہ ہیں (از افادات)

اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ کو اور ایمان والوں کو منافق دھوکہ کیسے دیتے تھے؟ وہ تو اپنے دل کے عقائد ظاہر کرتے ہیں وہ تو صرف بچاؤ کے لئے ہوتا ہے تو دھوکہ کیا؟ جواب یہ ہے کہ اس طرح کی بات کرنے والے کو بھی جو کسی ڈر سے کہا جاتا ہے عام زبان میں مخادع کہا جاتا ہے۔ چونکہ منافق بھی قتل اور قید اور دنیاوی عذابوں سے بچنے کے لئے یہ چال چلتے تھے اور باطن کے عقائد ظاہر کے اضداد کہتے تھے اس لئے انھیں دھوکہ باز کہا گیا۔ ان کا یہ فعل گو دنیا میں کچھ دھوکہ دے بھی دے لیکن درحقیقت وہ خود اپنے تئیں دھوکہ دے رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس میں ہی کامیاب اور کام بنا جاتے ہیں اور دراصل یہ سبب ہوگا ان کی بربادی کا عذاب اور غضب خداوندی کا جس کے سہنے کی ان میں طاقت نہیں۔ پس یہ دھوکہ حقیقتاً ان ہی پر وبال ہوگا۔ وہ جس کام کو اپنا اچھا جانتے ہیں وہ ان کے حق میں برا اور نہایت برا ہوگا۔ ان کا کفر، شک اور تکذیب کی وجہ سے ان کا رب ان پر ناراض ہوگا۔ لیکن افسوس! انھیں اس کا شعور ہی نہیں اور یہ اپنے غلط خیالات ہی میں مست ہیں۔ ابن جریرؒ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ منافق لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کر کے وہ اپنی جان مال کا بچاؤ کر لیا کرتا ہے یہ کلمہ ان کے دلوں میں جاگزیں نہیں ہوتا۔ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں منافقوں کی یہی حالت ہے کہ زبان پر کچھ، دل میں کچھ، عقیدہ کچھ، عمل کچھ، صبح کچھ، شام کچھ، کشتی کی طرح جو ہوا کے جھونکے سے کبھی ادھر ہو جاتی ہے کبھی ادھر۔ (ابن کثیر)

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا
یَكْذِبُوْنَ ⑩

ان کے دلوں میں بیماری ہے پھر بڑھا دی اللہ نے ان کی بیماری اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔ (۲/۱۰)

اس سے پہلے والی آیت میں منافقین کے دعویٰ ایمان کو غلط اور جھوٹ قرار دے کر ان کے فریب اور بے شعوری کو ظاہر فرما دیا گیا اور یہاں ان (منافقین) کے دلوں میں موجود مرض اور اس کو بڑھ جانے نیز ان کی سزا کے متعلق صراحت فرمائی گئی ہے۔ "حضرات ابن عباسؓ و ابن مسعودؓ اور مفسرین کی ایک جماعت کے پاس بیماری سے مراد شک، کفر، نفاق اور ریا ہے" (ابن کثیر)
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روز بروز کامیابیاں اور اسلام کا دن بدن ترقی پانا منافقین کے لئے بڑا تکلیف دہ تھا۔ وہ حسد و بغض اور کینہ کے سبب دل ہی دل میں عداوت اور غصہ کی آگ میں جھلس رہے تھے۔ اس کیفیت کو قرآن حکیم نے "مرض" سے تعبیر فرمایا ہے۔ "انسان کے حالت طبعی سے خروج کو لغوی اعتبار سے مرض کہتے ہیں۔ رذائل نفسانی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ مجازاً نفاق و کفر کو بھی مرض سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ وہ انسان کے لئے ادراک فضائل اور تحصیل حیات اخروی کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ بیان ہوا ہے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اسلام اور مسلمانوں کی کامیابی، وسعت اور ترقی یا پھر کلام اللہ کے مسلسل نزول کو دیکھ دیکھ کر منافقین کے دل کے مرض کو دو طریقوں سے ترقی ہوتی رہی۔ اسلام کے غلبہ کے باعث یا یوں کہ کلام الٰہی کی ہر ہر آیت کے نزول کے ساتھ ان کے دل کی کڑھن اور جلن بڑھتی گئی اور فیظ و غضب میں اضافہ ہوتا گیا۔ مفسرین نے یہ دونوں پہلو اختیار کئے ہیں۔
"فزادھم" میں حرف "ف" بہت اہم ہے۔ یہ گویا اس کا اعلان ہے کہ آگے جس فعل کا ذکر آرہا ہے، وہ محض بطور ثمرہ یا نتیجہ پیدا ہوا ہے۔ حق تعالیٰ کی جانب سے اس قسم کے افعال کا انتساب صرف مجازی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ اللہ نے خواہ مخواہ ان سے یہ افعال کرا چھوڑے، بلکہ اس نے تو صرف وہ حالات وہ اسباب پیدا کر دیے جن سے ان بدنصیبوں نے اپنے مرض کے بڑھانے کا کام لیا،

ورنہ وہ اگر اپنی عقل اور ارادہ کا صحیح استعمال کرتے تو اپنی اسباب و حالات سے ہدایت بھی پا سکتے تھے۔ "کافروں کے لئے عذاب عظیم اور منافقوں کے لئے عذاب الیم یعنی دکھ پہنچانے والا فرمایا گیا ہے" (روح المعانی کشاف وغیرہ بحوالہ تفسیر ماجدی) خلاف واقع خبر کو جھوٹ کہا جاتا ہے۔ ایک دعویٰ ہے کہ خلاف عقیدہ بات بھی جھوٹ ہے بعض کہتے ہیں کہ جو اعتقاد اور واقعہ دونوں کے خلاف بیان ہوں گا وہ کذب ہے۔ علامہ حقانیؒ نے لکھا ہے "ان (منافقین) کے دل میں مرض ناراستی عارض ہے۔ جیسی جوں جوں فطرت کو درست کرنے والی اور روح کو صحت بخشنے والی باتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوتی گئیں ان کی برخلافی سے ان اصلی مرضوں میں ترقی ہوتی گئی۔ جس طرح جسمانی امراض کا نتیجہ موت ہے اسی طرح روحانی امراض کا ثمرہ اس عالم میں عذاب الیم ہے" (تفسیر حقانی)

قاریوں نے "یَکْذِبُوْنَ" کو "یُکَذِّبُوْنَ" بھی پڑھا ہے۔ یہ دونوں خصلتیں ان (منافقوں) میں تھیں، جھٹلاتے بھی تھے (ابن کثیر)۔ قرآن و حدیث کی اصطلاح میں ان نفسانی کیفیات کو بھی مرض کہا جاتا ہے جو نفس انسانی کے کمال میں خلل انداز ہوں اور جن کی وجہ سے انسان اپنے انسانی اعمال سے محروم ہو جاتا ہے۔ جس کا آخری نتیجہ روحانی موت و ہلاکت ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا کہ دلوں کے امراض خواہشات نفسانی کے اتباع سے پیدا ہوتے ہیں جیسے بدن انسان کے امراض اخلاط انسان کی بے اعتدالی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس آیت میں ان کے دلوں کے مخفی کفر کو مرض فرمایا گیا ہے جو روحانی اور جسمانی دونوں اعتبار سے بڑا مرض ہے۔ روحانی مرض ہونا تو ظاہر ہے کہ اپنے خالق کی ناشکری اور اس کے احکام سے سرکشی جس کا نام کفر ہے یہ خود روح انسانی کے لئے سب سے بڑا مرض اور شرافت انسانی کے لئے بدترین داغ ہے۔ دوسرے دنیا کی ذلیل اغراض کی خاطر اس کو چھپائے رہنا اور اپنے دل کی بات کو ظاہر کرنے کی بھی جرأت نہ ہونا یہ بزدلی و دنائت ہے جو روح کا بہت بڑا مرض ہے اور نفاق کا جسمانی مرض ہونا اس بنا پر ہے کہ منافق کے دل میں ہمیشہ دغدغہ رہتا ہے کہ کہیں میرا اصل حال نہ کھل جائے شب و روز اسی فکر میں رہنا خود ایک جسمانی مرض ہے (معارف القرآن)۔ خوب سمجھ لیا جائے کہ جو منافق تھے وہ کافر تو تھے ہی لیکن کافر کے علاوہ بھی کچھ اور تھے یعنی خادع و کاذب تو عذاب عظیم کے مستحق تو وہ اپنے کفر کی بنا پر یوں ہی تھے یہ منافقت کا عذاب الیم اس پر مستزاد گویا منافقوں پر دونوں عذابوں کا مجموعہ ہو گا۔ (ماجدی)

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾
اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور جب کہا جاتا ہے ان سے کہ مت فساد ڈالو زمین میں تو کہتے ہیں ہم تو سنوارنے والے ہیں۔ ہوشیار! وہی فسادی ہیں۔ لیکن نہیں سمجھتے۔ (۲/۱۱-۱۲)

حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود اور بعض دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بموجب ان آیات میں بھی منافقین کا ذکر ہے اور انھیں ان کے فساد فی الارض پر تنبیہ کی گئی ہے۔ زمین میں خدا کی نافرمانی کرنے کا حکم دینا زمین میں فساد کرنا ہے۔ جب کہ زمین و آسمان کی اصلاح اطاعت خدا اور رسول میں ہے۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ ان منافقوں کا فساد برپا کرنا یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کرتے تھے۔ جس کام سے منع کیا جاتا اسے کرتے تھے۔ فرائض خداوندی ضائع کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے سچے دین میں شک و شبہ کرتے۔ اس کی حقیقت و صداقت پر یقین کامل نہیں رکھتے تھے۔ مومنوں کے سامنے آتے تو اپنا ایمان جتاتے۔ حالانکہ دل اللہ اور اس کے رسول کے بارے میں شک اور وسوسہ سے بھرا پڑا تھا۔ موقع ملتا تو دشمنان کی امداد و اعانت کرتے تھے اور اللہ کے نیک بندوں کے مقابلہ میں ان کی پاسداری کرتے تھے اور باوجود مکاری اور مفسدانہ چال کے اپنے تئیں مصلح اور صلح کل کے حامی جانتے تھے۔

چونکہ منافقین کا ظاہر اچھا ہوتا ہے اس لئے مسلمانوں پر حقیقت پوشیدہ رہ جاتی ہے، منافق ایمانداروں کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے دھوکہ دیتے ہیں اور ان کے بے حقیقت دعووں اور کفار کے ساتھ ان کی پوشیدہ دوستیوں سے مسلمانوں کو خطرناک مصائب جھیلنے پڑتے ہیں۔ اس خطرناک رویہ کے باعث جب انھیں یکسوئی کی نصیحت کی جاتی تو جھوٹ بول پڑتے کہ ہم تو صلح کل ہیں۔ ہم کسی سے بگاڑ نہیں چاہتے، ہم فریقین کا ساتھ اتفاق رکھتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ وہ کہتے تھے کہ ہم ان دونوں جماعتوں یعنی مومنوں اور اہل کتاب کے درمیان صلح کرانے والے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ان کی بڑی جہالت ہے۔ جسے یہ صلح جانتے ہیں وہ عین فساد ہے۔ لیکن انھیں شعور ہی نہیں۔ (ابن کثیر)

گزشتہ آیت شریف کے لحاظ سے منافقین پر مرض قلب یہاں تک غالب آگیا کہ ان کو نیک و بد میں تمیز نہیں۔ اس لئے کہ جب کوئی مومن یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا خود خدائے تعالیٰ ان سے فرماتا ہے کہ تم ملک میں فساد نہ ڈالو، یعنی گناہ اور چغلخوری اور غمازی نہ کیا کرو تو اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہم تو بھلائی کرتے ہیں وہ اس غمازی اور گناہ کو بھلائی سمجھ گئے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دیکھو یہی لوگ مفسد ہیں مگر بے شعور ہیں کہ ان کو اپنے فساد اور اصلاح میں تمیز نہیں۔ علامہ حقانی نے متعلقات کے تحت لکھا ہے کہ کسی شے کا اعتدال سے باہر ہونا اور جو نفع کہ اس سے مقصود ہے اس کے قابل نہ رہنا اس کی نقیض صلاح ہے یعنی جس طرح فساد میں بگڑنا ہے ویسا ہی صلاح کا معنی میں سنورنا معتبر ہے۔ اس جگہ فساد سے مراد بقول حضرت ابن عباسؓ اور حسن و قتادہ رحمۃ اللہ علیہما معاصی ہیں جس طرح منافقین نے بزعم فاسد اپنے فساد کو صلاح بنایا اور "انما نحن مصلحون" میں صلاح کا انحصار اپنے ہی نفس پر کیا تھا اسی طرح اس کے رد میں لفظ "الا" اور "انھم ھم المفسدون" کلمہ میں انحصار فرمایا کہ بلاشک یہی مفسد ہیں، تاکہ کلام مقتضی حال کے مطابق ہو جائے۔ یہ ان منافقوں کی دوسری حرکت ناشائستہ تھی۔ (تفسیر حقانی)

(ان آیات) سے معلوم ہوا کہ قانون شریعت کے علاوہ کسی دین جاہلی پر قائم رہنا اس کے طور طریقوں کی اشاعت کرنا فساد فی الارض کا مترادف ہے۔ امن عالم اور نظام اقوام قائم جب ہی رہ سکتا ہے جب عمل درآمد قانون شریعت پر ہے۔ اس راہ سے انحراف بلکہ سر مو تجاوز کرنا بھی دنیا کو بدنظمی، ابتری، بے حیائی، کشت و خون، ظلم، خیانت اور ہر قسم کی طبقاتی جنگ و کشمکش کو دعوت دینا ہے۔ چنانچہ دنیا عملاً اس کا تجربہ بار بار کر چکی ہے اور اس وقت بھی کر رہی ہے۔ "واذا قیل لھم" کا قائل کون ہے۔ مومنین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اللہ تعالیٰ، تفسیر کبیر کے بموجب الفاظ میں گنجائش ان سب کی ہے۔ فساد عربی میں اردو کے مفہوم سے کہیں زیادہ وسعت رکھتا ہے اور کسی ایک ہی نہیں بلکہ ہر قسم کی برائی اور خرابی پر حاوی ہے۔ (تفسیر ماجدی)

ان آیات میں منافقین کے اس مغالطہ کا ذکر ہے کہ وہ فساد کو اصلاح سمجھتے اور اپنے آپ کو مصلح کہتے تھے۔ یہاں واضح کر دیا گیا کہ فساد اصلاح زبانی دعووں پر دائر نہیں ہوتے، ورنہ کوئی چور ڈاکو بھی اپنے آپ کو مفسد کہنے کو تیار نہیں، بلکہ مدار کار اس کام پر ہے جو کیا جا رہا ہے، وہ فساد ہے تو کرنے والے کو مفسد ہی کہا جائے گا (معارف)۔ اس طرح (منافقین) مومن و کافر دونوں کو راضی رکھتے ہیں کہ ہم پالیسی داں ہیں اور مصلح کل ہیں۔ معلوم ہوا کہ صلح کلی فساد کی جڑ ہے، مومنا خالص اچھا ہے اور مومن خالص مبارک ہے (نور العرفان)۔ اب جو شخص فساد پھیلائے اور حق کا اعراض کرنے کو اصلاح کہنے پر مصر ہو اس کے قلب و نظر کو بیمار نہ کہا تو کیا کہا جائے۔ اب آپ اپنے گرد و پیش

پر نگاہ ڈالئے جتنے نئے فرقے اور نئے مذہب جنم لے رہے ہیں ان کو بانی بھی دین کی اصلاح اور قوم
کی فلاح کا دعویٰ ہی کرتے ہیں۔ لیکن ان کی فتنہ پردازیاں آئے دن جو گل کھلا رہی ہیں ان کو باعث
ملّت قوم کا ذہنی اتحاد بھی پاش پاش ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان نادان دوستوں اور دانا دشمنوں کے مکر و
فریب سے امت کو بچائے اور ہمیں توفیق بخشے کہ ہم ان کو پہچان سکیں۔ آمین۔ (ضیاء القرآن)

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ
أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ۝ اور جب کہا جائے انھیں ایمان
لاؤ جیسے ایمان لائے (اور) لوگ تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جس طرح ایمان لائے بیوقوف
خبردار! بے شک وہی احمق ہیں مگر وہ جانتے نہیں۔ (۲/۱۳) اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن مسعود اور
بعض دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ربیع بن انس، عبدالرحمن بن زید رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ جب ان منافقوں کو صحابہؓ کی طرح
اللہ تعالیٰ پر اس کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر اس کے بھیجے ہوئے رسولوں پر ایمان لانے کو، موت کے بعد جی اٹھنے اور جنت
و دوزخ کی حقانیت کے تسلیم کرنے کو، خدا اور رسول کی تابعداری کرنے، نیک اعمال بجا لانے اور برائیوں سے رکنے کو کہا جاتا ہے
تو یہ ملعون فرقہ ایسے ایمان کو بے وقوفوں کا ایمان بتاتا ہے۔ ان منافقین کے جواب میں یہاں بھی خود پروردگار عالم نے
جواب دیا اور تاکیداً حصر کے ساتھ فرمایا بے وقوف تو یہی ہیں لیکن ساتھ ہی جاہل بھی ایسے ہیں کہ اپنی بے وقوفی کا احساس
بھی نہیں رکھتے نہ اپنی جہالت و ضلالت کو سمجھ سکتے ہیں اس سے زیادہ ان کی برائی اور ہدایت سے دوری اور کیا ہوگی۔
(ابن کثیر) النَّاسُ۔ ناس، ال کے داخلہ کے بعد معرفہ ہو گیا۔ اب مراد ساری نوع انسان نہ رہی بلکہ وہ مشخص
و مخصوص افراد رہ گئے جو مخاطبین کے نزدیک معلوم و معروف تھے۔ روایتوں میں عبداللہ بن سلام وغیرہ حق شناس یہود کے نام
آتے ہیں جنھوں نے اسلام کی صداقت کو قبول کر لیا تھا۔ یہ بھی جائز ہے کہ الناس کو انسان کامل کے معنی میں لیا جائے
اس صورت میں مراد ہوگی کہ ایمان ان کی طرح لاؤ جو صفت انسانیت میں کامل ہیں اور واقعی انسان کہلانے کے مستحق ہیں
اس سے یہ اشارہ نکلا کہ جو منکرین ہیں وہ صورۃً انسان ہیں لیکن حقیقتاً انسانیت کے لحاظ سے گر گئے ہیں۔ (ملاحظہ ہو قبول
ایمان پر منافقین کا جواب میں اللہ تعالیٰ ... "کہ کیا ہم (ایسا) ایمان لے آئیں جیسا کہ کم عقل ایمان لائے ہیں؟")
یہ طرز اس وقت کے یہود اور سچے مسلمانوں (صحابہ) پر۔ (اگر بنظر غائر دیکھا جائے) یہی طریقہ آج تک چلا آ رہا ہے
"روشن خیالوں" اور "اہل تجدد" کے دربار سے آج بھی "جمود پسند" "تاریک خیال" وغیرہ کیسے کیسے خطابات خالص و مخلص
(بیوقوفی)
اہل ایمان کو عطا ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے حمق اور نافہمی کا کیا ٹھکانا ہے۔ پہلے فساد کو اصلاح کہہ رہے تھے اب
حق والوں سے حمق یہ ہے کہ عقل، دور اندیشی اور حکمت کو بے عقلی ٹھہرا رہے ہیں۔ سفیہ اس کم عقل کو کہتے ہیں
جسے اپنے نفع و نقصان کی پوری تمیز نہ ہو۔ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ کی ترکیب میں تمام اسی زور منافقین کی
سفاہت پر ہے کس درجہ بے وقوف ہیں یہ لوگ کہ اپنے نفع نقصان میں تمیز نہیں کرتے۔ (خازن، ابن جریر، قرطبی
کشاف، بیضاوی، المنار بحوالہ تفسیر ماجدی) فساد کے ذکر میں تو منافقین کو لا یشعرون کا لقب دیا گیا اور
ایمان لانے کے بارے میں لا یعلمون فرمایا گیا۔ اس میں ایک نکتہ ہے کہ فساد امر محسوس ہے اور لا یشعرون
بھی محسوسات میں بولا جاتا ہے بخلاف ایمان کے کہ اس پر مطلع ہونا از قسم علم ہے کہ جو نظر و تامل سے حاصل ہوتا ہے
دوم سفہ ایک قسم کا جہل ہے اس کے مقابل میں علم کا لانا کمال بلاغت ہے۔ منافقین کے قبیح (عیب)

بیان کرنے میں ابتدا اور نکتہ مرعی (رعایت ملحوظ) رکھا ہے وہ یہ کہ لا یشعرون اور لا یعلمون کے مفعول کو ذکر نہیں کیا تاکہ ان کا بے شعوری اور جہالت عام طور پر ثابت ہو جائے یعنی یہ بات نہیں کہ وہ فلاں بات نہیں جانتے بلکہ کچھ بھی نہیں جانتے (حقانی) منافقین راست بازی کو بے وقوفی اور نفاق کو دانشمندی سمجھتے ہیں۔ (ترجمان القرآن) منافقین کے سامنے صحیح ایمان کا ایک معیار رکھا گیا کہ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ یعنی ایمان لاؤ جیسے ایمان لائے اور لوگ اس میں لفظ ناس سے مراد صحابہ کرام ہیں۔ وہی ایمان معتبر ہے جو صحابہ کرام کے ایمان کی طرح ہو۔ صحابہ کرام کا ایمان ایک کسوٹی ہے جس پر باقی ساری امت کے ایمان کو پرکھا جائے گا۔ "جو اس کسوٹی پر صحیح ہو اسی کو شرعاً ایمان اور اس پر عمل کرنے والا مومن ہے" اس کے خلاف کوئی عقیدہ اور عمل خواہ وہ بظاہر کتنا ہی اچھا نظر آئے اور کتنی ہی نیک نیتی سے کیا جائے اللہ کے نزدیک ایمان معتبر نہیں۔" ان لوگوں نے (منافقوں) صحابہ کرام کو بے وقوف کہا اور یہی ہر زمانے کے گمراہوں کا طریقہ رہا ہے کہ جو ان کو صحیح راہ بتلائے اس کو بے وقوف قرار دیتے ہیں۔ (معارف القرآن) اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں کو بیوقوف کہنا منافقین کا طریقہ ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ خود اپنے (نیک) بندوں کا جواب دیتا ہے کہ رب نے انہیں جواب میں احمق فرمایا۔ تیسرا یہ کہ علماء کو بے دینوں کے طعنوں سے گھبرانا نہیں چاہیے کیونکہ یہ بے دینوں کا ہمیشہ سے طریقہ رہا ہے (نور العرفان) وہ لوگ جن کے نزدیک نفع و نقصان اور سود و زیاں جانچنے کی کسوٹی صرف دنیا کا عیش و آرام اور عزت و جاہ ہے ان کے نزدیک وہ مستیان عشق جو دانش سے محروم ہیں جو اپنے دین و ایمان کے لئے سود و ضرر کی بازی لگا دیتے ہیں لیکن حقیقت میں ان سے زیادہ دانا اور کون ہے جنہوں نے فانی دے کر باقی کو لے لیا۔ اور ان سے بڑھ کر احمق کون ہے جنہوں نے خزینہ آخرت کے عوض بیچ دیا آپ کو اپنے ہاتھوں اور رب کریم کی خوشنودی سے محروم کر دیا۔ (ضیاء القرآن)

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ○ اور جب ملتے ہیں ایمان والوں سے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب اکیلے ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے پاس تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو صرف (ان کا) مذاق اڑا رہے تھے (2/14)

مطلب یہ ہے کہ یہ بدباطن (منافقین) مسلمانوں کے پاس آ کر اپنا ایمان اور دوستی اور خیر خواہی ظاہر کر کے انہیں دھوکے میں ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ مال و جان کا بچاؤ بھی ہو جائے اور بھلائی اور غنیمت کے مال میں حصہ بھی قائم ہو جائے اور جب اپنے والوں میں ہوتے ہیں تو ان کا سا کہنے لگتے ہیں۔ جب خلوت میں پہنچتے ہیں اپنے شریر سرداروں کے پاس تو کہتے ہیں کہ ہم بے شک تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ان سے (مسلمانوں) سے استہزاء کرتے ہیں۔ (ابن کثیر) علامہ عبدالحق حقانی نے لکھا ہے کہ جب منافق مسلمانوں سے ملتے تھے تو ان کو خوش کرنے کو کہتے تھے کہ ہم بھی ایمان لائے اور جب اپنے سرداروں کے پاس جاتے تو نہایت تاکید سے یہ کہتے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو مسلمانوں سے بطور دل لگی کے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ دیتے ہیں وہ سیدھے سادھے لوگ ہیں ہماری اس بات کو سچ جان کر ہمیں اپنے دلی ارادوں اور اپنے رازوں سے مطلع کرتے اور فوائد میں شریک بنا لیتے ہیں۔ منافقین اپنی چالاکی سے ایمان والوں کو ان کے بھولے پن سے بے وقوف سمجھ کر اپنا ایمان جتلانے میں قسم اور کلام موکد کی ضرورت نہ سمجھتے تھے سو اس کو خدا تعالیٰ نے آمَنَّا کے ساتھ تعبیر کیا اور کفار بالخصوص کفر کے سردار جو بڑے چلتے پرزے اور پرلے درجے کے ہوشیار تھے وہ بغیر قسم اور کلام موکد کے کب کسی کا اعتبار کرتے اس لیے ان سے اِنَّا مَعَكُمْ تاکید کہتے اور بجائے کفر کے ان سے محبت جتلاتے تھے (تفسیر حقانی) منافقین کی ایک ذہنیت یہ بھی تھی کہ جب عوام مسلمانوں کے مقابلے میں تو اکڑتے رہتے لیکن مسلمانوں میں جو صاحب اثر و اقتدار ہوتے ان کے آگے خود جھک جاتے (ان کی خوشامد اور خوشنودی کے لیے) اور ان سے بہ تملق پیش آتے۔ منافقت ایمانی کے بعد طبیعت میں تملق پیدا ہو جانا بھی کچھ قدرتی سا ہے۔ شَيَاطِينِهِمْ مادہ شطن کے معنی خیر و حق سے بُعد (دوری) کے ہیں اور شاطن، شیطن دونوں بعید کے معنی میں ہیں۔ شیطان (بہ صیغہ نکرہ) کا لفظ عربی میں بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے ہر سرکش اور ہر کفر کا ساتھ دینے والے کو شیطان کہتے ہیں، انسان ہو، جن ہو، حیوانات سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ گو ابلیس کے لئے شیطان بطور ایک اسم وصف کے مخصوص ہے۔ حدیث شریف میں شیطان اسی وسیع مفہوم میں آیا ہے۔ شیطان کے ایک معنی انسان کے اخلاقی اور روحانی مرض کے ہیں اور لفظ کا یہ استعمال حدیث نبوی میں آیا ہے۔ یہاں شیاطینھم سے مراد رؤسا یہود و منافقین لئے گئے ہیں۔ جو اپنی سرکشی اور طغیان کے لحاظ سے خود بھی شیطان بنے ہوئے تھے نیز ان کے کاہن جن کے یہ لوگ معتقد تھے۔ شیاطینھم سے ایک کھلی مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب اپنے کفر کا ساتھ دینے والوں سے ملتے ہیں۔ خَلَوْا إِلَىٰ خلیٰ کا صلہ جب الیٰ آتا ہے تو معنی ہو کے ہیں

کسی کے ساتھ تنہا ہونے کے یا تنہائی پا لینے تک۔ الیٰ حرف الیٰ جب کسی دوسری چیز کے ساتھ ملا کر لایا جاتا ہے تو اس کی صحبت کا مفہوم ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے چنانچہ یہاں بھی اسی مفہوم صحبت ہی آیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ منافقین جب تنہائی میں اپنے سرداروں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم دل وجان سے تو آپ ہی کے ساتھ ہیں باقی مسلمانوں کے سامنے تو ان کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں۔ استہزاء کے معنی تمسخر کرنے ہنسی اڑانے اور مذاق کرنے کے ہیں (تنویر المقباس، معالم التنزیل، ابن کثیر، تاج العروس، مفردات غریب القرآن، ابن جریر وغیرہ بحوالہ تفسیر ماجدی)
راستبازوں کی تحقیر اور ایمان والوں کا تمسخر ان لوگوں (منافقوں) کا شیوہ ہے۔ (ترجمان القرآن)
منافقین کے نفاق اور دورخی پالیسی کا (قرآن حکیم) اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ یہ لوگ جب مسلمانوں سے ملتے تو کہتے تھے کہ ہم مومن مسلمان ہیں اور جب اپنی قوم کے کافر لوگوں سے ملتے تو کہتے تھے کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں اور تمہاری قوم کے فرد ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ تو محض تمسخر اور استہزاء کے طور پر بے وقوف بنانے کے لئے ملتے ہیں۔
(معارف) منافقین کا رویہ یہ تھا کہ مسلمانوں سے ملتے تو انھیں کہتے کہ ہم ایمان لا چکے ہیں اور کفار کے سرغنوں سے ملتے یا ان کے پاس تنہا ہی جاتا تو انھیں یقین دلاتے کہ ہم اپنے مذہب پر قائم ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ ہماری بات چیت یا اٹھنا بیٹھنا اس وجہ سے ہرگز نہیں کہ ہم ان کا دین قبول کر چکے ہیں بلکہ ہم تو اس طرح ان کو بے وقوف بناتے ہیں اور ان کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ علامہ قرطبیؒ نے لفظ استہزاء کی لغوی تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اصل الاستہزاء الانتقام۔ استہزاء کا معنی انتقام لینا ہے۔ (ضیاء القرآن)

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ○

اللہ سزا دے رہا ہے انھیں اس مذاق کی اور ڈھیل دیتا ہے انھیں تاکہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔ (۲/۱۵)

پچھلی والی آیت میں منافقین کے اس رویہ یعنی مسلمانوں سے ملیں تو کہیں کہ ہم ایمان لا چکے ہیں اور جب اپنے سرغنوں کے پاس جائیں تو انھیں یقین دلائیں کہ ہم تمہارے (یعنی ان شیاطین) ساتھ ہیں مسلمانوں سے ہمارا ملنا جلنا محض ان کا مذاق اڑانا ہے۔ منافقین کے اس مکروہ عمل کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کا اس آیت میں جواب ارشاد ہے کہ "اللہ تعالیٰ بھی ان سے استہزاء فرماتا ہے اور انھیں ان کی سرکشی میں بھٹکنے دے گا۔"

علامہ قرطبی نے لفظ استہزاء کی لغوی تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اصل الاستهزاء الانتقام۔ استہزاء کا معنی انتقام لینا ہے۔ اس تحقیق کے مطابق اللہ یستھزی بھم کا معنی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کی شرارتوں کا انتقام لیتا ہے اس معنی میں اللہ تعالیٰ کی طرف استہزاء کی نسبت میں کوئی قباحت نہیں۔ نیز اہل عرب میں یہ عام محاورہ ہے کہ جب کوئی کام کسی عمل کی سزا دینے کے لئے کیا جائے تو اس کی تعبیر بھی اسی لفظ سے کر دیتے ہیں جس لفظ سے اس عمل کی تعبیر کی گئی ہو جس پر سزا یا عقاب کیا جا رہا ہے مثلاً جزاء سیئة سیئة مثلها یعنی برے عمل کی جزاء بھی اسی طرح بری ہوا کرتی ہے حالانکہ سزا جو عدل و انصاف کا عین تقاضہ ہوتا ہے بری نہیں ہوتی۔ یا نسوا اللہ فانسٰھم۔ انھوں نے خدا کو بھلا دیا اور خدا نے ان کو بھلا دیا۔ حالانکہ خدا کی ذات بھول سے پاک ہے لیکن ان کے بھلانے پر جو سزا دی تھی اس کو بھلانے سے تعبیر کیا گیا۔ اسی طرح استہزاء پر منافقین کو جو سزا دی تھی اس کو بھی استہزاء سے بیان کر دیا گیا کیونکہ یہ استعمال محاورۂ عرب کے عین مطابق تھا اس لئے کفار جو قرآن پر اعتراض کرنے کے لئے کسی ادنیٰ سے بہانے کی متلاشی رہتے تھے اس استعمال پر کوئی اعتراض نہ کر سکے۔ (ضیاء القرآن)

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کرو۔ تو ظاہر ہے اس کا بدلہ لینا حقیقتاً برائی نہیں۔ زیادتی کے مقابلہ میں بدلہ لینا زیادتی نہیں لیکن لفظ دونوں جگہ ایک ہی ہے حالانکہ پہلی زیادتی ظلم ہے اور دوسری زیادتی عدل ہے۔ اسی طرح جہاں جہاں قرآن حکیم میں ایسی عبارتیں ہیں وہاں یہی مطلب ہے۔ ایک اور مطلب یہ ہے کہ دنیا میں یہ منافق اپنی اس پلید پالیسی سے مسلمانوں کے ساتھ مذاق کرتے تھے خدا نے بھی ان کے ساتھ یہی کیا کہ دنیا میں انھیں امن و امان عطا ہو حالانکہ یہ عذاب میں ہیں۔ قیامت کے دن انھیں کوئی امن نہیں یہاں تو ان کے مال اور جانیں بچ گئیں لیکن خدا کے یہاں دردناک عذاب کا شکار ہوں گے۔ امام ابن جریر نے اس قول کو ترجیح دی ہے اور اس کی نسبت کو خدا کی سزا اس لیے کہ مکر دھوکہ اور مذاق جو بیہودہ ہو اس سے تو خدا کی ذات پاک ہے ہاں انتقام اور بدلے کے طور پر یہ الفاظ خدا کی نسبت کہنے میں حرج نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی یہی فرماتے ہیں کہ یہ ان سے بدلہ ہے ...... اور ان کی سزا ہے۔ یمدھم کا مطلب ڈھیل دینا اور

ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ منافقت و کفر میں ڈوبتے رہنے والوں کا دل الٹا [illegible] دلوں میں اثر ہو جاتا ہے اور اس طرح گناہ بھی جاتا ہے اور حقیقتاً ان کی تمام راہیں ان پر بند ہو جاتی ہیں یعنی ایسے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے اور اندھا ہو جاتا ہے وہ کیسے ہدایت پا سکتا ہے۔ آنکھوں کے اندھے ہونے کے نتیجے میں محرومی کا نقصان آتا ہے مگر دل کے اندھے ہونے کے نتیجے کا نقصان کہیں [illegible] دل کے اندھے ہونے کے نتیجے میں محرومی کا نقصان آتا ہے۔ (ابن کثیر) خداتعالیٰ کے متعلق تمسخر کے معنی کہ خداتعالیٰ سے ہنسی کرنے والوں کا ادب [illegible] سے صحبت کرنا خداتعالیٰ کا ادب ہے اس طرح صحبت کرنا ہے اور بات کی [illegible] کو خداتعالیٰ نے یہ فرمایا کہ تم میرے بندوں سے ہنسی کرتے ہو ان کی طرف سے ہنسی [illegible] تم گمراہی میں چھوڑ دیئے گئے [illegible] جس طرح تم [illegible] سمجھتے ہو [illegible] اس کا نام ہے (تفسیر حقانی) اللہ یستہزئ بہم یعنی ان کے تمسخر کا انہیں بدلہ دیتا ہے۔ مجازات، جزا [illegible] کے موقع پر محاورہ عرب میں یہ طریقہ عام ہے کہ جزا [illegible] کو اصل فعل ہی کا نام دے دیا جاتا ہے۔ خالق کائنات (اپنے قانون تکوینی کے مطابق) نے بندوں کو جو آزادی و اختیار دے رکھا ہے اس میں وہ خواہ مخواہ دست اندازی کبھی نہیں کرتا [illegible] اس کے قانون تکوینی کے مطابق [illegible] استہزاء کا [illegible] (ابن قتیبہ، بیضاوی، تاج العروس، قرطبی بحوالہ تفسیر ماجدی) [illegible] اس سے یہ سبق معلوم ہوتا ہے [illegible] (انوار [illegible])

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝

(یہ) وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لیا گمراہی ہدایت کے بدلے مگر نفع بخش نہ ہوئی ان کی (یہ) تجارت اور وہ صحیح راہ پانے والے تھے (۲/۱۶)

حضرات ابن عباس، ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم سے مروی ہے کہ انہوں نے ہدایت چھوڑ دی
اور گمراہی لے لی۔ حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں انہوں نے ایمان کے بدلے کفر قبول کیا۔ مجاہدؒ فرماتے ہیں ایمان لائے
پھر کافر ہو گئے۔ قتادہؒ فرماتے ہیں ہدایت پر گمراہی کو پسند کرتے ہیں۔ (ابن کثیر) ان کی بدبختی کی انتہا ہے کہ
انہوں نے ہدایت و ایمان جیسی جنس بے بہا قیمت میں دے کر خریدی بھی تو کس چیز کو؟ اور بے حقیقت چیز گمراہی کو
(اشتروا)۔ اشتروا کا خریدا، اس کے معنی کسی چیز کا معاوضہ میں لینا۔ ایمان کا قبول کر لینا ان منافقین کے
بالکل اختیار میں تھا، لیکن اس کے بجائے انہوں نے روش کفر کی اختیار کر لی۔ اہل عرب ہر استبدال کے موقع
پر اشتروا بولتے ہیں۔ یہاں بالهدی میں ب عوض کے معنی ہے۔ تجارت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اصل
سرمایہ محفوظ رہے اور منافع اس پر بڑھتا رہے یہاں منافقین کا خریدنا نفع کا کیا ذکر عقل سلیم کے
سرمایہ ہی کو انہوں نے برباد کر ڈالا۔ ربح اردو میں نفع کے معنی دیتا ہے۔ فما ربحت میں حرف ف
نے صراحت کر دی کہ یہ عدم نفع نتیجہ اور معلول ہے خریداری ضلالت کا۔ (معالم التنزیل، مفردات غریب القرآن
کبیر، روح المعانی بحوالہ ماجدی) علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ یہاں اشتروا بمعنی استحبوا ہے یعنی
انہوں نے کفر کو پسند کر لیا اور حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ فرماتے ہیں لغت عرب میں شراء کا لفظ
ایک چیز کو دوسری چیز سے بدل لینے کے معنی میں عام مستعمل ہے۔ انہوں نے منافقت کا فتنہ ۔۔ کو اس
ڈالا تھا کہ وہ مسلمانوں کی رفاقت میں شامل ہو کر دنیاوی فوائد حاصل کریں گے اور طمانیت سے الفرجمع
رکھیں گے اور ان کا جو بھرم ہے قائم رہے گا لیکن ان کی کوئی امید بر نہ آئی اللہ تعالیٰ نے ان کا پردہ چاک کر دیا
حقیقت کے مطابق نہ نفع کمایا تو کجا ان المتقون نے تو اپنا سرمایہ (فطرت سلیمہ) ہی تباہ کر ڈالا (ضیاء القرآن)
وہ فطرت جو خدا تعالیٰ کی طرف سے ان کو عطا ہوئی ہے (کہ اگر اس کا کوئی عوارض و موانع پیش نہ آئے
تو اس کی وجہ سے نیکی اور حیات ابدی کے رستہ پر چل سکے۔) ان منافقوں نے اپنے اندر اخلاق رذیلہ اور
ملکات فاسدہ پیدا کر کے اس نور فطرت کو بجھا دیا (جس کو خدا تعالیٰ نے ہدایت کے بالعوض گمراہی خریدنے
سے تعبیر فرمایا ہے) ان لوگوں نے اپنے نزدیک تو بڑی عقلمندی اور نفع دینے والی تجارت کی تھی کہ منہ سے کلمہ
توحید کہہ دیا اور اس کی بدولت منافع دنیا کو حاصل کیا۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس تجارت میں نفع نہ ہوا
کیونکہ عمر عزیز اور نور فطرت جس کی کوئی قیمت نہیں اس کو صرف کر کے دنیا چند روزہ اور شہوات نفسانیہ حاصل کرنا
موتی ہاتھ سے دے کر مٹی کا کھلونا لینے جیسا ہے جیسا کہ احمق اور لڑکے کرتے ہیں۔ اور نہ سرے سے ان کو تجارت کرنا آئی
کیونکہ تجارت یہ تھی کہ اپنی جان و مال کو خدا تعالیٰ کی راہ میں صرف کر کے حیات ابدی حاصل کرتے

جیسا کہ خود فرماتا ہے: اے ایمان والو کیا میں بتا دوں وہ تجارت جو تمہیں دردناک عذاب سے بچا لے۔ ایمان رکھو اللہ اور اس کے رسول پر، اور اللہ کی راہ میں اپنے مال و جان سے جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔ (۶۱/۱۰۔۱۱) اصل میں ان منافقت پسند لوگوں نے برباد کر دیا اور نفع ان کو نہیں ملا۔ (تفسیر حقانی) اس آیت میں منافقین کے اس حال کا ذکر ہے کہ انہوں نے اسلام کو ان قریب سے دیکھا۔ اس کا ذائقہ بھی چکھا اور کفر میں پہلے سے شناسا تھے۔ پھر کفر و اسلام دونوں کو دیکھنے سمجھنے کے بعد انہوں نے اپنی کمتر دنیوی اغراض کی خاطر اسلام کے بدلے کفر ہی کو ترجیح دی۔ ان کے اس عمل کو قرآن کریم نے تجارت (بیوپار) کا نام دے کر یہ تنبیہ کر دی کہ ان کو بیوپار کا بھی سلیقہ نہ آیا کہ بہترین قیمتی چیز یعنی ایمان دے کر ردی اور تکلیف دہ چیز یعنی کفر خرید لیا۔ (معارف القرآن) اس طرح کہ کفر ان کے سامنے تھا اور اسلام بھی۔ انہوں نے اسلام چھوڑ کر کفر اختیار کیا، یہ گویا خرید و فروخت ہوئی (نور العرفان) تجارت ایک شئے کا دوسری شئے سے معاوضہ ہے۔ تجارت میں دو چیزیں ہوا کرتی ہیں ایک مال جس سے کوئی چیز خریدی جاتی ہے دوسری وہ چیز جس کو خریدا جاتا ہے اور تجارت میں نفع بھی ہوتا ہے اور نقصان بھی یہاں منافقین محض نقصان اٹھا رہے ہیں کہ گمراہی خرید لی اور نہ قرآن ہی سمجھنے کی صلاحیت ہے اور نہ [illegible] معاملت کا سلیقہ ہے۔ جبکہ اہل ایمان اس قدر دانشمند اور [illegible] ہیں کہ وہ جو بیوپار کرتے ہیں اس میں فائدہ ہی فائدہ ہوتا ہے نقصان کا امکان ہی نہیں کیونکہ انہوں نے اللہ کی وحدانیت اور رسول کی رسالت پر ایمان لایا اور اس پر ثابت قدمی سے قائم رہے۔ نہ دوسروں [illegible] یقینی ہے [illegible] اور اخلاص عمل کے ذریعہ انہوں نے دنیا اور آخرت کا نفع اپنے لئے محفوظ کر لیا جبکہ منافق اور کافر کے لئے ہر قدم نقصان و بربادی ہے

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ
فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ۝ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝ ان کی مثال اس شخص
کی سی ہے جس نے (شب تاریکی میں) آگ جلائی جب آگ نے اس کے ارد گرد کی چیزیں روشن کیں تو
اللہ نے ان لوگوں کی روشنی زائل کر دی اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں دیکھتے۔ (یہ) بہرے
ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں کہ (کسی طرح سیدھے رستے کی طرف) لوٹ ہی نہیں سکتے۔ (۲/۱۷،۱۸)

ان آیات کی تفسیر میں حضرات ابن عباسؓ، ابن مسعود اور بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے بعد کچھ لوگ اسلام میں آئے مگر پھر منافق بن گئے۔ ان کی مثال اس شخص جیسی ہے جو اندھیرے میں تھا پھر آگ جلا کر روشنی حاصل کرے اور اس پاس کی بھلائی دیکھنے لگے اور معلوم کرے کہ کس راہ میں کیا ہے کہ اچانک آگ بجھ جائے روشنی جاتی رہے اور معلوم نہیں ہو سکتا کہ کس راہ میں کیا کیا ہے۔ اسی طرح منافق شرک و کفر کی ظلمت میں تھے پھر اسلام لا کر بھلائی برائی یعنی حلال و حرام وغیرہ دیکھنے لگے مگر پھر کافر ہو گئے اور حرام و حلال اور خیر و شر میں کچھ تمیز نہ رہی۔ عبدالرحمن بن زیدؒ فرماتے ہیں منافقین کی یہی حالت ہے کہ ایمان لاتے ہیں اور اس کی پاکیزہ روشنی سے ان کے دل جگمگا اٹھتے ہیں لیکن پھر کفر کی وجہ سے وہ روشنی ختم ہو جاتی ہے۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں جب منافق لا الٰہ الا اللہ پڑھتا ہے دل میں نور پیدا ہوتا ہے پھر جہاں شک کیا وہ نور گیا۔ جس طرح لکڑیاں جب تک جلتی رہیں روشنی رہی جہاں بجھیں روشنی ختم ہو گئی۔ حضرت قتادہؒ کا قول ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کہنے سے منافق کو دنیوی نفع مثلاً مسلمانوں سے رشتے ناتے کا ملنا، دین و ورثہ کی تقسیم جان و مال کی حفاظت وغیرہ مل جاتا ہے لیکن چونکہ اس کے دل میں ایمان اور اس کے کاموں میں سچائی نہیں ہوتی اس لئے موت کے وقت وہ سب منافع سلب ہو جاتے ہیں جیسے آگ کی روشنی جو بجھ جاتی ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں موت کے وقت منافق کی بداعمالیاں اندھیروں کی طرح اس پر چھا جاتی ہیں اور کوئی بھلائی کی روشنی اس کے لئے باقی نہیں رہتی جس سے اس کی توحید کی تصدیق ہو۔ وہ بہرے ہیں حق کے سننے سے، اندھے راہ راست کو دیکھنے سمجھنے سے ہدایت کی طرف لوٹ نہیں سکتے نہ توبہ انہیں نصیب ہوتی ہے نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ (ابن کثیر) اللہ کے نبی نے دین اسلام روشن کیا اور خلق نے اس میں راہ پائی اور منافق اس وقت اندھے ہو گئے آنکھوں کی روشنی نہ ہو تو مشعل کیا کام آوے۔ کاش کہ گونگا اندھا ہو تو کسی کو پکارے یا کسی کی بات سنے بہرا اگر ہو تو اشارے سے دوسروں کی راہ پر آوے۔ منافقوں کو نہ عقل کی آنکھ ہے کہ آپ سے بچائیں نہ مرشد کی طرف رجوع ہے کہ وہ ہاتھ پکڑے نہ حق کی بات کو کان رکھتے ہیں۔ ایسے شخص سے توقع نہیں کہ راہ پا وے۔ (موضح القرآن)

دنیا میں کلمہ توحید پڑھ کر منافقانہ اور حفظ جان و مال وغیرہ فوائد حاصل کئے مگر مرتے ہی یہ چراغ گل ہو گیا تو انفعال ہے۔ جس مرکب اور قبر کی تاریکیوں میں ہاتھ ملتے رہ گئے اور وہاں اگلے سے جو نہ سکا کوئی ذریعہ نہ وہاں سے رجوع کر کے پھر دنیا میں آ سکتے ہیں۔ (حقانی) یہ ان کی مثال ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے

کچھ عرصہ تک وہ اس پر قدرت رکھتے تھے پھر انہوں نے اس کو ضائع کر دیا اور ہدایت کو حاصل نہ کیا۔ ان کا حال حسرت و افسوس اور حیرت و غربت ہے۔ اس میں وہ منافق بھی داخل ہیں جنہوں نے اظہارِ ایمان کیا اور دل میں کفر رکھ کر اقرار کی روشنی کو ضائع کر دیا اور وہ بھی جو مومن ہو کر مرتد ہو گئے اور وہ بھی جنہیں فطرتِ سلیمہ عطا ہوئی اور دلائل کی روشنی نے حق کو واضح کیا مگر انہوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا اور گمراہی اختیار کی اور جب حق سننے ماننے کہنے راہِ حق دیکھنے سے محروم ہوئے تو کان زبان آنکھ سب بیکار ہیں۔ (حاشیہ کنز الایمان - صدر الافاضل)

(دوسری آیت میں) الذی استوقد واحد ہے لیکن یہاں ضمائر بصورت جمع کے استعمال ہوا ہے۔ مثل کے مفہوم میں ایک پہلو ندرت و غرابت کا بھی شامل رہتا ہے یعنی ایسا حال جو عجیب و غریب ہو۔ نورہم ... ظلمٰت، نور کے صیغہ واحد اور ظلمات کے صیغہ جمع میں لطیف نکتہ یہ پیدا کیا گیا ہے کہ راہِ حق و ہدایت خطِ مستقیم کی طرح صرف ایک ہی ہے اور گمراہیاں خطِ منحنی کی طرح بے شمار ہو سکتی ہیں۔ (قرطبی، کشاف، ابن القیم بحوالہ تفسیر ماجدی) منافقوں کے دو گروہ تھے۔ ایک وہ جو دل سے کفر پر جمے ہوئے تھے اور صرف زبان سے اپنے آپ کو مسلمان کہتے۔ دوسرا وہ جو ایمان تو قبول کرتے لیکن مصائب و مشکلات سے گھبرا کر پھر اسلام سے دست بردار ہو جاتے۔ یہاں پہلے گروہ کی مثال بیان ہوئی ہے۔ (ضیاء القرآن) منافقین حق کے ظاہر ہونے کے باوجود اندھے رہے گمراہی میں گرفتار رہے۔ کفر و معصیت کی تاریکیوں میں حق (یعنی اللہ تعالیٰ) کی روشن تجلی کے آنے سے ان کا نفس پریشان ہو اٹھا۔ روشنی کے باعث ان کی نظر اور سماعت بیکار ہو گئی۔ الغرض اس روشنی میں بھی کچھ دکھائی نہ دیا۔ ان کی آنکھوں کی روشنی سلب کر لی گئی اس میں خود ان کا اپنا قصور تھا کیونکہ وہ حق و صداقت کے دروازے سے رخ موڑ کر تیرگی ہی میں لطف محسوس کرتے تھے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے الغرض ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ یہ منافقین گونگے بہرے گونگے اور اندھے ہو گئے ان کے حق کی طرف پلٹ آنے اور راہ پر آنے کی توقع نہیں۔

أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِيٓ ءَاذَانِهِم مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ وَاللّٰهُ مُحِيطٌۢ بِالْكٰفِرِينَ ۝ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَآ أَضَآءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ ۙ وَإِذَآ أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

یا ان کی مثال مینہ کی سی ہے کہ آسمان سے (برس رہا ہو اور) اس میں اندھیرے پر اندھیرا (چھا رہا) ہو اور (بادل) گرج (رہا) ہو اور بجلی (کوند رہی) ہو تو یہ کڑک سے (ڈر کر) موت کے خوف سے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ اور خدا کافروں کو (ہر طرف سے) گھیرے ہوئے ہے۔ قریب ہے کہ بجلی (کی چمک) ان کی آنکھوں (کی بصارت) کو اچک لے جائے۔ جب بجلی (چمکتی اور) ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں اور جب اندھیرا ہو جاتا ہے تو کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔ اور اگر خدا چاہتا تو ان کے کانوں (کی شنوائی) اور آنکھوں (کی بینائی) دونوں کو زائل کر دیتا۔ بلاشبہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ (۲:۱۹،۲۰)

یہ دوسری مثال ہے جو دوسری قسم کے منافقین کے لئے بیان کی گئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر کبھی حق ظاہر ہو جاتا ہے اور کبھی پھر شک میں پڑ جاتے ہیں۔ تو شک کے وقت ان کی مثال برسات کی سی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قرآن کی مضبوط آیتیں ان منافقین کی قلعی کھول دیتی تھیں اور ان کے چھپے ہوئے عیوب ظاہر کر دیتی تھیں اور اپنی نورانیت سے انہیں مبہوت کر دیتی تھیں۔ جب اندھیرا ہو جاتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں یعنی جب ان پر ایمان ظاہر ہو جاتا ہے تو ذرا روشن دل ہو کر پیروی بھی کرنے لگتے ہیں لیکن پھر جہاں شک و شبہ آیا کہ دل میں کدورت اور ظلمت بھر گئی اور پھر بھٹکے ہوئے کھڑے رہ گئے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ اسلام کو ذرا عروج ملا تو ان کے دل میں قدرے اطمینان پیدا ہوا لیکن جہاں اس کے خلاف نظر آیا تو یہ الٹے پیروں کفر کی طرف لوٹنے لگے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ان کا روشنی میں چلنا حق کو جان کر کلمہ اسلام پڑھنا ہے اور اندھیرے میں ٹھہر جانا کفر کی طرف لوٹ جانا ہے۔ اور بہت سے مفسرین کا یہی قول ہے اور زیادہ صحیح اور ظاہر بھی یہی قول ہے (ابن کثیر)

ان منافقوں کی مثال آسمانی بارش کی ہے (کہ جس میں سراسر نفع ہے لیکن ساتھ ہی اس میں بجلی اور کڑک اور بادلوں اور بارش اور رات کی اندھیریاں بھی ہوتی ہیں) یعنی مشقت اعمال کو جس طرح انسان طبعاً اس کڑک اور بجلی کی چمک سے ڈرتے ہیں کانوں میں انگلیاں ڈال کر کڑک سے بچنا چاہتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے چمک سے بچنا چاہتے ہیں اسی طرح منافق اس آسمانی بارش سے جو حیات ابدیہ کا پانی ہے یعنی اسلام اور قرآن مجید اور اس کے مواعظ حسنہ اور وعدہ وعید جن کی کڑک اور چمک بجلی کی چمک اور کڑک سے زیادہ ہیبت دکھاتے ہیں اور کانوں میں انگلیاں ڈالتے ہیں تاکہ ان نصیحتوں سے جو حب شہوات اور لذت فانیہ کے سبب بمنزلہ آفات ہیں بچ جائیں۔ [illegible] بجلی کی چمک ہوئی تو ان میں چلنے لگتا ہے اور روشنی سے اندھیرے میں ٹھہر جاتا ہے یہی حال

ان منافقوں کا برق ایمان اور نور قرآن سے ہی جب اسلام کی بجلی چمکتی ہے تو آنکھیں ہیں یعنی جب فوائد ظاہرہ غنیمت وغیرہ پیش آتے ہیں تو راہ اسلام پر چلنے لگتے ہیں ورنہ پھر اسی جبلی گمراہی سے رک جاتے ہیں (ماخوذ از تفسیر حقانی)

کصیب تمثیل ہے اس باران رحمت سے اشارہ ہے طلوع اسلام کی جانب السماء یہاں کثرت سے ابر کے معنی بادل یا سحاب کے نقل ہوئے ہیں افق کے معنی بھی لئے گئے ہیں۔ ہر چیز جو انسان سے اوپر کی طرف ہو لغت میں سماء ہی ہے۔ او یہاں تفصیل کرتا ہے کہ دیکھنے والا اوپر کی دونوں تمثیلوں میں سے ایک اختیار کر سکتا ہے فیہ میں ضمیر کا مرجع صیب بھی ہو سکتا ہے اور السماء بھی۔ ظلمٰت کا تعلق فی صیب سے بھی ہو سکتا ہے اور فی السماء سے بھی یا حاصل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے من الصواعق یہاں اشارہ ہے قرآن مجید کی سماعت اور اس کے وعیدوں کی جانب حذر الموت موت عام خیال کے مطابق ختم زندگی اور عدم محض کا نام ہے لیکن قرآن اسے زندگی ہی کی طرح ایک مستقل اثباتی وجود دیتا ہے اور اہل سنت کا مسلک ہے۔ جب اسلام کی مادی فتحمندیاں اور کامیابیاں دیکھتے ہیں تو ان منافقین اور مذبذبین کے قدم گویا اضطراراً اسلام کی طرف بڑھنے لگتے ہیں مطلب حق تو ان کے دل میں سرایت ہی نہیں البتہ مصلحت کچھ دیر کے لئے آمادہ کر دیتی ہے لیکن جب اہل ایمان کو امتحان و آزمائش پیش آنے لگتے ہیں تو یہ منافقین اور مذبذبین ڈگمگا جاتے ہیں یقینی تذبذب ہی پھر ٹھٹھک جاتے ہیں اور اسلام کی طرف ان کے بڑھتے قدم رک جاتے ہیں۔ ولو شاء اللہ اس سے یہ اشارہ نکل آیا کہ مؤثر حقیقی صرف ارادہ الٰہی ہے اور اسباب ظاہری میں تاثیر جو کچھ بھی پیدا ہوتی ہے مشیت الٰہی سے پیدا ہوتی ہے ہدایات و تنبیہیں قدیر صیغہ مبالغہ ہے زور و قوت پر قادر سے زیادہ۔ اللہ قادر مطلق ہے یہ قرآن کی (کبیر، مفردات، روح المعانی، معالم التنزیل، بیضاوی، ابن القیم، تنویر المقباس ماخوذ از تفسیر ماجدی)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۙ الَّذِي
جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ
بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

اے لوگو اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت (عمارت) بنایا اور آسمان سے بارش برسا کر تمہارے کھانے کے لئے انواع و اقسام کے میوے پیدا کئے پس کسی کو اللہ کا ہمسر نہ بناؤ اور تم جانتے ہو۔ (۲/۲۱-۲۲)

یہاں سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی الوہیت کا بیان ہے وہی اپنے بندوں کو عدم سے وجود میں لایا اسی نے ہر طرح کی ظاہری اور باطنی نعمتیں عطا فرمائیں اسی نے زمین کا فرش بنایا اس میں مضبوط پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں اور آسمان کو چھت بنایا۔ پانی آسمان سے اتارنے کا مطلب بادل سے نازل فرمانا ہے اس وقت جب کہ لوگ اس کے پورے محتاج ہوں پھر اس پانی سے طرح طرح کے پھل پھول پیدا کرتا ہے جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کے جانور بھی (مستفید ہوں) پس سب کا خالق سب کا رازق سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اسی وجہ سے وہی مستحق ہے ہر قسم کی عبادتوں کا اور شریک نہ کئے جانے کا اسی لئے فرمایا اللہ تعالیٰ کے شریک نہ ٹھہراؤ حالانکہ تم جانتے ہو۔ (ابن کثیر) اللہ تعالیٰ خالق اکبر، رب العلمین اور بادی مطلق ہے اس کی شانیں اول تمام مخلوقات کا پیدا کرنا دوم آسمان کو خیمہ اور زمین کو فرش بنا کے اس پر تکلف مکان میں رکھنا سوم قسم قسم کے کھانے کھلانا۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اس آیت میں عبادت کا حکم دیا ہے کہ جو خدا تعالیٰ اور بندہ میں نہایت عمدہ رابطہ ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت کر دیا (تھا) کہ عبادت خاص اسی کی ذات پاک کا حق ہے کس لئے کہ خدا کے سوا جن چیزوں کی تم عبادت کرتے ہو ان میں سے کسی نے نہ تم کو پیدا کیا ہے نہ تمہارے باپ دادا کو نہ تمہاری پرورش کا پتہ کیونکہ جس طرح تم محتاج ہو اسی طرح وہ چیزیں بھی ہیں۔ پھر ان کو بلا وجہ کسی امر کا مالک سمجھ کر عبادت کرنا خیال باطل ہے۔ جس طرح اس پیرایہ نے شرک کی جڑ کو کاٹ دیا اسی طرح الحاد اور دہریت کے درخت کو بھی جڑ بیخ سے اکھاڑ دیا۔ خدائے پاک نے منکر کے روبرو اس آیت میں چند دلائل سے اپنے وجود اور اپنی صفات کا ثبوت نہایت خوبی سے واضح کر دیا اور لطف یہ کہ وہ دلیلیں ایسی ہیں کہ اس کے انکار سے جاہل اور لطف یہ ہے (کا اظہار ہوتا ہے) (تفسیر حقانی) قرآن مجید کا مخاطب سارا عالم انسانیت ہے۔ قرآن مجید کے اصل پیغام کا عنوان اول مسئلہ توحید ہے جو تمام عقائد و مسائل کی اصل و اساس ہے۔ رَبَّكُمُ ۔ دلیل ہے کہ صفات الٰہی میں کتنی بڑی اہمیت صفت ربوبیت کو حاصل ہے خَلَقَكُمْ عمل تخلیق خالص خدائی عمل ہے ہمسر و مساوی ہونا تو چھوڑ کر رہا، یا قوت و معاون کی حیثیت سے بھی کوئی شریک تخلیق نہیں الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ اس سے پچھلی انسانی نسلوں کا مراد ہونا تو ظاہر ہی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ خلقت انسانی سے قبل روئے زمین پر کوئی اور مخلوق بھی آباد رہی ہو جیسا کہ توریت میں درج

ہو سکے۔ قرآن نے ان سب ممکن مخلوقات پر چھا دیا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ کا ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے "کہ تم اس
طریقہ سے بچ جاؤ" (دیکھئے پیرو ورڈ تمارنیس) لعلّ سے تو اغلباً شک اور امید و آرزو کے لئے لیکن قرآن مجید میں
جہاں حق تعالیٰ کی طرف سے ادا ہوا ہے تو کسی محل کی آرزو کی جگہ اس کے وقوع کا اور شک و احتمال کی جگہ یقین کا
مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ اردو ترجمہ "تاکہ" سے بھی جائز ہو گیا ہے۔ جَعَلَ لَكُمُ زمین ہو یا آسمان کوئی بھی از خود
نہیں بن گئے بلکہ جو کچھ بھی ہیں بنائے گئے ہیں۔ اللہ کے بنائے ہوئے اور اسی قادر مطلق کے زیر فرمان ہیں ...... دوسری
تعلیم ساتھ ہی ساتھ یہ ملی کہ زمین و آسمان انسان کے لئے خلق ہوئے ہیں۔ انسان زمین و آسمان کے لئے خلق
نہیں ہوا ہے۔ أرض ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے قدموں کے نیچے ہو۔ ارض میں اصل تخیل پستی کا ہے انسان
کے تعلق میں اس کا اصلی وصف فراش یا ما یفرش کا ہے یعنی وہ ایسی چیز ہے جو بچھادی گئی یا بچھی
ہوئی ہے۔ سماء ہر اس بلند چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے سر کے اوپر ہو۔ سماء میں اصل تخیل بلندی کا ہے
زمین جس طرح بطور فرش ہمیں نیچے سے سنبھالے ہوئے ہے آسمان اسی طرح ہمیں اوپر سے ڈھانپے ہوئے
ہے کہ تاریخ و محسوس ہر وہ چیز اسی قدر بلند ہے کہ ٹیلے، بڑے بلند پہاڑوں کی بلندیاں اونچے سے اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں
پرندوں اور طیاروں کی اُڑان سے بڑی بلند پروازیاں سب اس کے اندر سما جاتی اور یہ سب جب نسبت ہی زمین تو حقیقت
کا اطلاق اس پر بھی نہ ہوگا تو اور کس پر ہوگا۔ السَّمَآء بالکل جائز ہے کہ یہاں ابر کے معنی میں ہو ..... آسمان
اور بارش سب خدائے واحد ہی کی مخلوق اور مصنوع ہیں ..... فَلَا تَجْعَلُوا میں ف سببیہ ہے یعنی جب کہ
تمہیں ان نعمتوں کے ساتھ پیدا کیا وہ ہے ہی اس لائق کہ کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ نِدّ عربی
میں مثل و مشابہ اور مخالف و مدمقابل کو بھی کہتے ہیں۔ أَنْدَادًا کے معنی اضداد اور اشباہ دونوں
لئے گئے ہیں۔ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (اپنے الہام فطری اور عام فہم بشری کی بنا پر کہ سب کا حاکم سب کا خالق
بس وہی رب کل ہے) (مفردات، معالم، تاج العروس، لسان، ابو السعود، کشاف و کبیر بحوالہ تفسیر ماجدی (تلخیص))
عبادت کا فائدہ عابد ہی کو ملتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ اس کو عبادت یا کسی چیز سے نفع حاصل ہو۔ پہلی
آیت میں نعمت ایجاد کا بیان فرمایا کہ تمہیں اور تمہارے آباء کو معدوم سے موجود کیا اور دوسری آیت میں اسباب
معیشت و آسائش و آب و غذا کا بیان فرما کر ظاہر کر دیا کہ وہی ولی نعمت ہے تو غیر کی پرستش محض باطل ہے
(صدر الافاضل۔ حاشیہ کنز الایمان) توحید الٰہی کی تلقین اور خالقیت و ربوبیت سے استدلال جس کا یقین
انسان کی فطرت میں ہے۔ (ترجمان القرآن)

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ ۖ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ○ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ○

اور اگر تمہیں شک ہو اس میں جو ہم نے نازل کیا اپنے (برگزیدہ) بندے پر تو لے آؤ ایک سورۃ اس جیسی اور بلا لو اپنے حمایتیوں کو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔ پھر اگر ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں جو تیار رکھی گئی ہے کافروں کے لیے (۲/۲۳-۲۴)

بیان: توحید کا صواب ثابت کرنے کے بعد اب نبوت کے سلسلہ میں کافروں سے خطاب ہے یعنی ہم نے جو قرآن پاک اپنے بندے (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر اتارا ہے اسے اگر تم اللہ کا کلام نہیں مانتے تو تم اور تمہارے مددگار سب مل کر قرآن کی طرح ایک سورۃ ہی اس جیسی بنا لاؤ جب تم ایسا نہیں کر سکتے اور اس سے عاجز ہو تو پھر اس قرآن کے کلام اللہ ہونے میں شک کیوں کرتے ہو۔ شہداء سے مراد مددگار اور شرکاء ہیں جو ان کی مدد اور موافقت کیا کرتے تھے تو مطلب یہ ہوا کہ جنہیں تم نے اپنا معبود بنا رکھا ہے انہیں بھی بلا لو اور ان سے بھی مدد چاہو پھر اس جیسی ایک سورۃ تو بنا لاؤ۔ (ابن کثیر) اور اگر تم کو قرآن کے کلام خدا ہونے میں شک ہے تو تم اپنے سب معبودوں اور مددگاروں کو ساتھ لے کر ایک سورۃ تو ایسی بنا لاؤ جو فصاحت اور حسن النظم و خوبی میں قرآن کے مثل ہو (سورۃ وہ ہے جس کا اول و آخر ہو کم سے کم تین آیتیں اس میں ہوتی ہیں) تو اگر تم سچے ہو اپنے اس دعوے میں کہ یہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بنایا ہوا کلام ہے تو ایسا کر دکھاؤ کہ آخر تم بھی ویسے ہی عربی فصیح و بلیغ ہو اور جب تم اس سے عاجز ہو گئے حق تعالیٰ نے فرمایا اگر تم اس کے کرنے سے عاجز ہو (اور یقیناً عاجز ہو) تو اس بات پر یقین کرو کہ یہ قرآن آدمی کا کلام نہیں اور اللہ پر ایمان لا کر اس آگ سے بچو جس کا ایندھن کافر اور بت اور دیگر پتھر ہیں یعنی کہ وہ آگ بوجہ تیزی حرارت کے دنیا کی آگ کے مانند نہیں کہ جس میں لکڑی وغیرہ جلتی ہے وہ تیار کی گئی ہے کافروں کے عذاب دینے کو۔ (حقانی تفسیر) اہل اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید معجزہ ہے اور اس کی مانند بنانا قوت بشریہ سے خارج ہے خواہ معانی کی رو سے ہو یا اس کے ساتھ عبارت میں بھی اعجاز کی پہنچ ہی نہ ہو پائی اور یہ بشر سے بھی کہنا جمہور اہل اسلام یہی کہتے ہیں کہ قرآن اپنی فصاحت و بلاغت میں اعلیٰ درجہ پر ہے اور اس کی مثل بنانا بشر سے محال ہے اور یہ بات خدا تعالیٰ نے اس لئے قرآن میں رکھی کہ عرب کو اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا گھمنڈ تھا خدا تعالیٰ نے اس میں ان کو عاجز کر کے اس کا منجانب اللہ ہونا ثابت کر دیا۔ (حقانی) بندہ خاص سے حضور پرنور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ شہداء سے مراد ہیں جنہیں کفار پوجتے ہیں اور ان کی حمایت میں قرآن پاک کا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ انکار کرتے ہیں (آیت) سے معلوم ہوا کہ دوزخ پیدا ہو چکی ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ مومن گنہگار اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جہنم میں ہمیشہ نہیں (صدر الافاضل حاشیہ کنز الایمان) یہ بات قابل غور ہے کہ سورت کی ... دلیل معجزہ ہوا کہ یہ حیثیت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی ماننے ... قرآن شریف ...

نبوت کی بڑی دلیل ہے (ولن تفعلوا یعنی ہرگز نہ کر سکو گے ۔) یعنی کہ (ان لوگوں کو) کہ قیامت تک ایسی نہ کر سکو گے کیا
کچھ ہو شک وشبہ اس میں ہے وہ ایسا نہ آتا ہوگا اور کوئی دقیقہ سعی کا کوئی اٹھا رکھا ہوگا پھر عاجز ہو کر ایسا منہ نہ کر بیٹھ رہنا
قطعی دلیل ہے کہ قرآن مجید معجزہ ہے ۔ (بیان القرآن) اس سے پہلی دو آیتوں میں توحید کا ثبوت تھا ان دونوں
آیتوں میں رسالت محمدی (علیہ الصلوۃ والسلام) کا اثبات ہے وہ ہدایت جو قرآن لے کر آیا ہے اس کے دو
محور ہیں توحید اور رسالت ۔ حاصل یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں قرآن کریم کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلیٰ
معجزہ قرار دے کر آپ کی رسالت اور سچائی کا ثبوت پیش کیا گیا ہے ۔ (معارف القرآن) رسالت و وحی (ترجمان القرآن)
قرآن یعنی جس کلام کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے بتدریج حسب ضرورت و مصلحت اتارا ہے عبد پر ہمارے (واضح ہو کہ) آپ عبدیت میں
کامل (ہیں) من مثلہ کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال کثرت سے مثلہ فی البلاغۃ اور حسن النظم کے منقول ہوئے
ہیں لیکن اعجاز میں من وجہ المعنی کا پہلو بھی اہل تحقیق سے چھوٹنے نہیں پایا ہے یعنی مثل ہذا القرآن حقا وصادقا
لا باطل فیہ ولا کذب (روح جریر [illegible]) اور امام رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں متعدد پہلو اختیار کیے ہیں پورا قرآن
نہیں پورا قرآن نہ سہی اس کا نصف یا ثلث بھی نہیں اس کی کسی ایک سورۃ ہی کے برابر تم تصنیف کر دکھاؤ من مثلہ
میں من تبعیضیہ کی تبعیض کی تبیین کی گئی ہے اور تبعیض کیا گیا ہے مثلہ میں ضمیر قرآن کی
جانب ہے ۔ شہداء آخر میں شہداء سے عموماً مراد حامیوں اور ناصروں سے لی گئی ہے ۔ قرآن
کا سیدھا سادہ دعویٰ ہے کہ وہ انسان کا نہیں خدا کا کلام ہے اگر کوئی اسے امکان بشری کے اندر سمجھتا ہے تو ذرا اس کا
ادنیٰ اور ہلکا سا نمونہ سب کی متحدہ کوشش سے پیش کر دکھائے ۔ فاتقوا جواب شرط ہے اور حرف "ف" نتیجہ کو بتلا رہا
ہے یعنی جب قرآن کی مثل کی بڑی دلیل کے وار سے عاجز آ چکے ہو اور اپنے انکار پر خود کوئی دلیل نہیں رکھتے تو اب انکار حق کو عناد
بجز عناد و ہٹ دھرمی کے اور کس چیز کا نتیجہ ہو سکتا ہے اور جہنم کا عذاب آتشی اس عناد اور انکار حق کا لازمی اور قطعی نتیجہ ہے
(مظہری "بیضاوی" مدارک "معانی" قرطبی وغیرہ کو دیکھو یا حاوی "تلخیص") یہ چیلنج صرف عرب کے شعراء اور بلغاء کے لیے نہیں بلکہ ہر دور
میں کے سب منکروں کو دیا جا رہا ہے ۔ چودہ صدیاں گزر چکی ہیں اس چیلنج کا جواب آج تک نہیں دے سکا اور نہ قیامت تک
دے سکے گا (ضیاء القرآن)

وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ
كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِن ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوا هَٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِن قَبْلُ وَ
أُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝

اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کو خوشخبری سنا دیجیے کہ ان کے لئے (نعمت کے) باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ جب انہیں ان میں سے کسی قسم کا میوہ کھانے کو دیا جائے گا تو کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے اور وہاں ان کے لئے پاک بیویاں ہوں گی اور وہ بہشتوں میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۲/۲۵)

ربط آیات: اوپر کی آیات میں کفار و منکرین کے عذاب اور رسوائی کا ذکر ہوا۔ یہاں مومنین و صالحین کی جزاء، ثواب اور سرخروئی کا تذکرہ ہے۔ ایمان کے ساتھ کفر کا، کفر کے ساتھ ایمان کا بیان، نیکوں کے ساتھ بدوں کا اور بدوں کے ساتھ نیکوں کا لازمی تذکرہ قرآن حکیم کی شان ہے۔ مثانی ہونے کے معانی میں سے ایک معنی یہ بھی ہے کہ جس چیز کا بیان ہوتا ہے ساتھ ہی اس کے مقابل کی چیز کا بھی ذکر ہو جاتا ہے۔ کسی چیز کو ذکر کر کے اس کی نظیر کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ یہ معنی بھی متشابہ ہونے کا ہے اور یہ دونوں لفظ قرآن کے اوصاف میں وارد ہوئے ہیں۔ اسے مثانی بھی کہا گیا ہے اور متشابہ بھی فرمایا گیا ہے۔ (انوار الکنز) اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام، عبادت اور سخاوت وغیرہ کئے ہیں ان کو یہ مژدہ سنا دو کہ ان کو مرنے کے بعد اس عالم میں ایسے باغ ملیں گے کہ جن میں نہریں بہتی ہوں گی اور ان باغوں کے میووں میں عجیب لطف ہو گا کہ رنگ و بو اور شکل و صورت یکساں، مزہ سے الگ الگ۔ یہاں تک کہ جب کوئی میوہ ان کو ملے گا اور اس قدر بہشت سے سمجھیں گے کہ یہ تو ہم پہلے کھا چکے ہیں مگر جب کھائیں گے تو نیا لطف پائیں گے اور ان کو جس طرح حکایات اور کھانے عمدہ و نفیس ہوں گے اسی طرح پاکیزہ بیویاں بھی ملیں گی کہ جو عورتوں کی باتیں ہوتی ہیں ان میں نہ ہوں گی۔ نہ حسد نہ بغض ہی اس پر ان کو نہ ڈر ہے موت یا ان نعمتوں کے ختم ہونے کا بلکہ وہ اسی عیش و آرام کے ساتھ ہمیشہ رہیں گے۔ (حقانی) صالحات یعنی نیکیاں وہ عمل ہیں جو شرعاً اچھے ہوں۔ ان میں فرائض و نوافل سب داخل ہیں (جلالین)۔ مسئلہ: یہ بشارت مومنین صالحین کے لئے مقید ہے اور گنہگار مومنوں کو جو بشارت دی گئی ہے وہ مقید بمشیت الٰہی ہے کہ چاہے از راہ کرم معاف فرمائے، چاہے گناہوں کی سزا دے کر جنت عطا کرے (انوار الکنز)
بشر مومنین اور صالحین عبادت گزاروں کے حق میں ہے۔ عملوا الصالحات نیکی ایمان سے الگ نہیں ایمان ہی کی عملی شکل کا نام ہے حسن عمل رضائے الٰہی کے مطابق اور ضابطہ شریعت کے موافق ہو۔ لهم میں "ل" استحقاق کا ہے۔ جنت وہ مخصوص دائمی باغ ہیں جو مومنین و صالحین کو بر بنائے وعدہ الٰہی آخرت میں ملیں گے۔ منها میں من ابتدائیہ من الجنات کے معنی میں ہے اور دوسرا من تبعیضیہ ثمرة کی تفخیم کے لئے۔ من قبل یعنی پہلے یعنی دنیا کے باغوں کے بھی ہو سکتے ہیں اور جنت کے باغوں کے۔ اہل تفسیر سے دونوں منقول ہیں۔ بعض اہل لطائف

واضح رہے کہ آیت سے یہ نکتہ نکلتا ہے کہ اسی دنیا کے اعمال حسنہ جنت میں طرح طرح کی نعمتوں کی شکل و تمثیل اختیار کریں گے اور اہل جنت کو حسنات دنیوی اور ان کے ثمرات اُخروی کے درمیان ایک خاص تشابہ و تماثل محسوس ہوگا۔ مطہرۃ میں طاہرۃ سے زور اور قوت زیادہ ہے (خوب پاک و صاف ہر طرح اور ہر اعتبار سے جسم کا، روح کا، ہر ممکن گندگی اور آلودگی سے ستھری، پاکیزہ۔) خلدون خلود کے معنی اسی حالت میں رہنے کے ہیں جس میں کوئی تغیر و خرابی پیدا نہ ہو۔ اور اصطلاح شریعت میں اس سے مراد وہ حالت ہے جسے کوئی فنا نہیں ابدی سرمدی زندگی۔ (تفسیر مدارک، روح المعانی، المنار، قرطبی، کبیر و بیضاوی، ابن جریر، بحر المحیط، تلخیص)